تزکیہ و احسان
یا
تصوّف و سلوک

تالیف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مترجم محمد الحسنی مرحوم
ایڈیٹر، البعث الاسلامی

تزکیہ و احسان (جس کو دورِ آخر میں تصوف کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ہے) کی اصل روح اور حقیقت، اسلامی و ایمانی زندگی کی تکمیل کے لئے اس کی اہمیت و ضرورت اور افراد، جماعتوں اسلامی حکومتوں اور قوموں و ملکوں پر اس کے حیرت انگیز اثرات اور انسان کی اخلاقی و روحانی ترقی اور بلند کردار میں اس کے بنیادی اور ناقابلِ تردید حصہ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ و جائزہ

مجلس نشریاتِ اسلام ۱۔ کے ۳۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸

مجلد ۸۰/۶

تزکیہ واحسان (جس کو دور آخر میں تصوف کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ہے) کی اصل روح اور حقیقت، اسلامی وایمانی زندگی کی تکمیل کے لئے اس کی اہمیت وضرورت اور افراد، جماعتوں، اسلامی حکومتوں اور قوموں وملکوں پر اس کے حیرت انگیز اثرات اور انسان کی اخلاقی وروحانی ترقی اور بلند کردار میں اس کے بنیادی اور ناقابل تردید حصہ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ وجائزہ۔

مُفکّرِ اسلام مولانا سیّد ابو الحسن علی ندوی

مترجم: محمد الحسنی مرحوم ایڈیٹر "البعث اسلامی"

مجلس نشریاتِ اسلام

۱۔ کے ۔۳۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۷۴۶۰۰

مفکر اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی

- ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ • رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند
- صدر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ • رکن مجلس انتظامی و مجلس علمی دارالمصنفین اعظم گڑھ
- رکن عربی اکادمی دمشق • رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
- رکن مجلس تاسیس رابطۂ عالم اسلامی مکہ معظمہ • رکن مجلس عاملہ موتمر عالم اسلامی بیروت
- رکن مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا
- سابق وزیٹنگ پروفیسر دمشق یونیورسٹی و مدینہ یونیورسٹی

نام کتاب ———— تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک
تصنیف ———— مفکر اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی
طباعت ———— شکیل پرنٹنگ پریس۔ کراچی
ضخامت ———— ۱۷۶ صفحات
ٹیلیفون : ۶۲۱۸۱۷

ناشر
فضل ربی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد نمبر۱ کراچی ۷۴۶۰۰

تزکیہ و احسان یا تصوّف و سلوک

ترجمہ کتاب "ربانیة لا رهبانیة"

عربی ———— تین ایڈیشن ———— کویت، دمشق، بیروت

اردو ———— تین ایڈیشن ———— لکھنؤ، کراچی

فہرست مضامین

"تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک"

۱۔ پیش لفظ	۹/۱۲
۲۔ اصطلاحات سے حقیقت، اور وسائل سے مقصد کی طرف	۱۳/۲۵
۳۔ تصوف و سلوک۔ ایک الہامی نظام	۲۶/۳۱
۴۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا اصلاحی و انقلابی کام	۳۲/۴۹
حضرت شیخ کا عہد اور ماحول	۳۲
مواعظ و خطبات	۳۴
توحید خالص اور غیر اللہ کی بے حقیقتی	۳۵
شکستہ دلوں کی تسکین	۳۹
دنیا کی صحیح حیثیت	۴۲
خلفاء اور حکامِ وقت پر تنقید	۴۳
دین کے لئے دلسوزی اور فکرمندی	۴۵
بیعت و تربیت	۴۶
۵۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ایک عارف باللہ اور محقق	۵۰/۹۵
ذوق عبودیت و انابت	۵۲

ذوق عبادت وانہماک	۵۴
زہد وتجرید وتحقیر دنیا	۵٦
سخاوت اور ایثار	۵۷
فروتنی وبے نفسی	٦۰
سکینت وسرور	٦۱
کمال اتباع سنت	٦۳
صالحین میں مقبولیت اور علماء وقت کی شہادت	٦۴
٦۔ تاتاریوں میں اشاعت اسلام	٦٦/۷۲
۷۔ دعوت عشق ومقام انسانیت	۷۳/۹۲
عشق ومحبت الٰہی	۷۳
جہان دل	۷۹
مقام انسانیت	۸۲
مقام انسانیت حضرت مخدوم بہاریؒ کے مکتوبات میں	۸٦
خالق کی نظر خاص	۸۷
امانت، محبت	۸۹
حاصل وجود	۹۱
۸۔ ہندوستان کے صوفیاء کرام اور ہندوستانی معاشرہ پران کا اثر	۹۳/۱۰۹
ہندوستان تصوف کا ایک مرکز ومنبع	۹۳
تصوف اور صوفیا سے لوگوں کا تعلق اور رجوع عام	۹۴

زندگی اور معاشرہ پر اثر	۹۶
بے رغبتی اور حق گوئی	۱۰۰
زہد و استغنار	۱۰۲
اشاعت علم	۱۰۵
پرورشِ خلائق	۱۰۶
انسانیت کی پناہ گاہیں	۱۰۸
۹۔ اہل تصوف اور دینی جدوجہد	۱۱۰/۱۲۵
۱۰۔ ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے	۱۲۶/۱۴۷
علم حقیقی اور علم ظاہری کا فرق	۱۲۶
فیضانِ محبت	۱۲۸
علم کا مقصد عمل ہے	۱۲۹
عارفین کی نگاہ میں متاع دنیا کی بے وقعتی	۱۳۱
مولانا نے انگریز گورنر کا استقبال کس طرح کیا؟	۱۳۳
شرفاء و غرباء کی مدد کا انوکھا طریقہ	۱۳۵
اخلاقی تربیت اور تشکیلِ سیرت میں اہل دل کا حصہ	۱۳۶
۱۱۔ اخلاص و محبت اور اخلاق و تربیت کا ایک مرکز	۱۳۸/۱۵۲
زندگی اور مختلف طبقات کا وسیع مطالعہ و تجربہ	۱۳۸
باہر کا انتشار اندر کے انتشار کا نتیجہ	۱۳۹
قلب کا خلا اور بگاڑ	۱۴۰

اخلاص کی کمی اور اخلاق کا فساد	۱۴۱
اخلاص و اخلاق کی جہانگیری اور کیمیاگری	۱۴۳
جماعت کا وجود افراد پر اور اجتماعی اصلاح انفرادی اصلاح پر موقوف ہے	۱۴۸
مخلص کے لئے خدا کی توفیق	۱۴۹
اجتماعی و متعدی کام کی اہلیت و صلاحیت	۱۵۱
قلوب و نفوس کی تربیت کا ایک مرکز	۱۵۲
۱۲۔ حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کا دمِ واپسیں	۱۵۳ / ۱۶۳
۱۳۔ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے آخری ایامِ زندگی	۱۶۴ / ۱۷۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد :-

وَالَّذِیْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝

(سورہ حشر-۱۰)

اور (ان کے لئے بھی) جو ان (مہاجرین) کے بعد آئے (اور) دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں گناہ معاف فرما، اور مومنوں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ (و حسد) نہ پیدا ہونے دے اے ہمارے پروردگار تو بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں مسلمانوں کی آئندہ نسلوں سے اس بات کا مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ گذشتہ نسلوں کے بارے میں ان کا رویہ شرح صدر اور اعتراف حق کا ہونا چاہیے، صدق و اخلاص، اطاعت رب، خوف و انابت، دین کی خدمت اور اسلامی سرحدوں اور قلعوں کی پاسبانی و حفاظت کے میدان میں جو سبقت اور فضیلت ان کو حاصل ہے،

اس کو دل سے تسلیم کرنا چاہیئے، ان کی طرف سے نئی نسل کے دلوں میں کوئی کینہ اور نفرت نہ ہو، ان کی خدمات کے اعتراف میں اس کو انقباض اور تکلیف محسوس نہ ہو، اس کی زبان ان کے لئے دعاگو اور ثناخواں رہے، ان کے عذر اور مجبوریاں اس کے لئے قابلِ قبول ہوں، اور وہ ان فروگذاشتوں سے جن سے کوئی فرد بشر محفوظ نہیں رہتا، درگذر سے کام لے، اس لئے کہ جو اجتہاد کرتا ہے، اس کے ساتھ خطا و صواب کا احتمال رہتا ہے، گرنے کا اندیشہ اسی سے ہوتا ہے جو چلنے اور دوڑنے کا ارادہ کرے، اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ نبیِّ معصوم صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت کے سوا دوسرے تمام لوگوں کے احکام و تعلیمات میں رد و قبول دونوں چیزوں کی گنجائش ہے۔

اس آیت کا ہم سے مطالبہ یہ ہے کہ ہم سلف صالحین اور ایمان و احسان کے شعبہ کے امام و پیشرو بزرگوں کے بارہ میں کوئی فیصلہ کرنے، ان کے بارہ میں کوئی رائے قائم کرنے اور ان پر کسی قسم کا حکم لگانے میں احتیاط سے کام لیں، اور اس میں کسی عجلت اور جذباتیت کا مظاہرہ نہ کریں، اور جب تک پوری طرح کسی مسئلہ کا اطمینان نہ ہو جائے اس پر قطعی حکم لگانے سے باز رہیں، اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ	مومنو! اگر کوئی بدکردار تمہارے پاس کوئی
فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا	خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کرلیا کرو (مبادا)
قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ	کہ کسی قوم کو نادانی سے نقصان پہنچا دو
مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ ٥ (سورہ الحجرات ٧)	پھر تم کو اپنے کئے پر نادم ہونا پڑے۔

پیش نظر کتاب ان مختلف مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے، جو اسی مقصد کی وضاحت کے لئے (عربی اور اردو دونوں زبانوں میں) مختلف اوقات میں لکھے گئے،

معنوی وحدت نے موضوع کے تنوع اور اوقات کے اختلاف کے باوجود ان سب مضامین کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے، ان میں یا تو اپنے علم و تجربہ کی بنیاد پر کسی خیال کی وضاحت کی گئی ہے یا زندگی اور اخلاقیات کے کسی خاص خلا، کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جس کا پُر کرنا بہت ضروری ہے، یا اہل حق کی اس جماعت کا دفاع ہے جس کو تنقید و نکتہ چینی کا مسلسل ہدف بنایا جاتا رہا ہے، اور اکثر ذاتی معلومات، عملی تجربہ اور اس کی زندگی کے گہرے مطالعہ اور تحقیق و جستجو کے بغیر ان پر بے تکلف رائے زنی بلکہ نشتر زنی کی گئی ہے۔

مصنف کو مختلف اسباب کی بنا پر خالص علمی و ادبی ماحول اور جدید سوسائٹی میں رہتے ہوئے ان حضرات کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان سے استفادہ کرنے کا موقع اپنے بہت سے معاصرین اور ہم عمروں سے زیادہ ملا، اور اس نے ان کو بہت قریب سے اور غور سے دیکھا ہے، اور اسے ان تاثرات و مشاہدات کو اپنے متعدد مضامین (عربی و اردو) میں پیش کرنے کی توفیق ہوئی۔

یہ مضامین طویل تجربہ اور عمیق مطالعہ کا نچوڑ ہیں، اور آج ان کا یہ مجموعہ "تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک" کے نام سے ایک احساس فرض اور ادائے قرض کے طور پر طالبین حق کے لئے شائع کیا جارہا ہے، اس میں متعدد جگہ ان اصحاب کا ذکر بھی ملے گا جن کے احسان سے پورے پورے ملک اور قومیں سبکدوش نہیں ہوسکتیں، اور جن کی مخلصانہ و مجاہدانہ کوششوں اور توجہات و فیوض سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو دولت اسلام اور نعمت ایمان اور آخر میں مرتبۂ احسان حاصل ہوا، جو نقد جاں بلکہ دولت کونین دے کر بھی مل جائے تو ارزاں ہے۔

متاع وصل جاناں بس گراں است
گر ایں سودا بجاں بودے چہ بودے

یہ مجموعۂ مضامین سب سے پہلے اجر و ثواب اور رضائے الٰہی کے شوق و طلب میں اور اس کے بعد اس امید میں شائع کیا جا رہا ہے کہ شائد اس سے کسی دل کے ساکن سمندر میں تموج و اضطراب پیدا ہو، سوئے ہوئے ایمانی جذبات پھر سے بیدار ہوں، اور ملت اسلامی ہند کے فہیم و ذکی اور انصاف پسند اور حق پرست افراد اس مسئلہ پر از سر نو غور کرنے اور خوب سے خوب تر کی دریافت و یافت پر آمادہ ہو سکیں۔

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی

۵؍۵-۱۳۹۹ھ

۳؍۴-۱۹۷۹ء

اصطلاحات سے حقیقت، اور وسائل سے مقصد کی طرف

اصطلاحات اور مروجہ الفاظ و عنوانات نے بعض اوقات حقائق کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے، اور ان کو بڑا نقصان پہونچایا ہے، دنیا کے علم و فن، زبان و ادب اور دین و مذہب میں اس زیادتی کی ایک طویل روداد ہے، ان اصطلاحات سے بسا اوقات ایک نیا تصور پیدا ہوگیا ہے، اس کے متعلق نئے نئے قسم کے سوالات اور اعتراضات پیدا ہوگئے، اختلاف و تنازعہ کا ایک لامتناہی سلسلہ اٹھ کھڑا ہوا، مختلف مذاہب اور مکتب خیال وجود میں آئے، دلائل اور منطق کی محفلیں آراستہ ہوئیں، افکار و خیالات میں تصادم ہوا، اور لوگ مختلف گروہوں اور جماعتوں میں بٹ گئے۔

اگر ہم ان نئے اصطلاحات اور عرفی ناموں کو ترک کر کے عہدِ ماضی کی طرف واپس ہوں، جب ان حقائق کے لئے بہت سادہ اور عام فہم الفاظ مستعمل تھے، اور بڑی سہولت کے ساتھ ان کیفیات اور معانی کی ترجمانی کی جاتی تھی، اور ان الفاظ کو اختیار کرلیں جو ہمارے اسلاف کے یہاں رائج تھے، تو یہ مسئلہ اسی وقت حل ہوجائے گا، اور تمام جماعتوں میں صلح ہوجائے گی۔

انھیں اصطلاحات میں ایک اصطلاح "تصوف" ہے، جو لوگوں میں بہت رائج ہے، اس سلسلہ میں طرح طرح کے سوال کھڑے ہوئے اور بحثوں کا ایک طویل سلسلہ قائم ہوگیا،

سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوا کہ اس لفظ کی حقیقت و مراد کیا ہے؟ اس کا مأخذ و منبع کیا ہے؟ آیا وہ "صوف" سے ماخوذ ہے یا "صفاء" سے "صفو" سے نکلا ہے، یا "صفہ" سے؟ یا وہ ایک یونانی لفظ صوفیا سے لیا گیا ہے، جس کے معنی حکمت بتائے جاتے ہیں۔[1]

آخر یہ لفظ کہاں سے برآمد کیا گیا، اور کس طرح اس کا رواج ہوا، جبکہ نہ قرآن و حدیث میں اس کا وجود ملتا ہے، اور نہ صحابۂ کرام اور تابعین کے اقوال میں، نہ خیر القرون میں اس کا سراغ ملتا ہے، اور ہر ایسی چیز جس کا حال اور جس کی یہ تاریخ ہو بدعت کہلانے کی مستحق ہے، غرض کہ اس طرح تصوف کے حامیوں اور مخالفوں میں ایک قلمی اور لسانی معرکہ برپا ہوگیا، اور اس کے نتیجے میں ایک مستقل کتب خانہ وجود میں آیا جس کا سرسری جائزہ لینا بھی مشکل ہے۔

اگر ہم اس اصطلاح کو ترک کر کے (جس سے ہم دوسری صدی میں روشناس ہوئے ہیں[2]) قرآن و حدیث اور عہد صحابہؓ و تابعینؒ کی طرف رجوع کریں اور کتاب و سنت کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کریں، تو ہمیں نظر آئے گا کہ قرآن دین کے ایک شعبہ اور نبوت کے ایک اہم رکن کی طرف خصوصیت سے توجہ دلاتا ہے، اور اس کو "تزکیہ" سے تعبیر کرتا ہے، اور ان چار ارکان میں اس کو شامل کرتا ہے، جن کی تکمیل حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت سے متعلق اور مقاصد بعثت میں شامل تھی۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا	وہی ہے جس نے اٹھایا امیوں میں ایک
مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ	رسول انھیں میں کا، پڑھ کر سناتا ہے ان کو
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ	اس کی آیتیں اور ان کو سنوارتا ہے، اور

---

[1] یہ سب الفاظ حقیقت تصوف کے سلسلے میں بیان کئے گئے ہیں، دیکھئے "دائرۃ المعارف" از بستانی۔ و "تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ" از جرجی زیدان۔ [2] کشف الظنون جلد ۱ صفحہ ۲۸۰ بحوالہ امام قشیری۔

كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔ سکھلاتا ہے، کتاب اور دانائی اور اس سے

(سورہ جمعہ ۔ ۲) پہلے وہ پڑے ہوئے تھے صریح بھول میں۔

تزکیہ سے مراد یہ ہے کہ انسانی نفوس کو اعلیٰ اخلاق سے آراستہ اور رذائل سے پاک و صاف کیا جائے، مختصر الفاظ میں تزکیہ کی وہ شکل جس کے شاندار نمونے اور مثالیں ہم کو صحابہ کرامؓ کی زندگی میں نظر آتی ہیں، اور ان کے اخلاص اور اخلاق کی آئینہ دار ہیں' وہ تزکیہ جس کے نتیجے میں ایسا صالح پاکیزہ اور مثالی معاشرہ وجود میں آیا، جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ عاجز ہے، اور ایسی معدلت شعار اور حق پرست حکومت قائم ہوئی جس کی مثال روئے زمین پر کہیں اور نہ مل سکی ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ زبانِ نبوت اسلام و ایمان کے ساتھ ایک خاص درجہ اور مرتبہ کا ذکر کرتی ہے، اور اس کو احسان سے تعبیر کرتی ہے جس سے مراد یقین و استحضار کی وہ کیفیت ہے جس کے لئے ہر صاحبِ ایمان کو کوشاں ہونا چاہئے، اور جس کا شوق ہر مرد مومن کے دل میں موجزن ہونا چاہئے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا" تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اس کو دیکھ رہے ہو، اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے" (بخاری مسلم)

جب ہم شریعت اسلامی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال و احوال پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو حصوں پر منقسم تھے ایک کا تعلق افعال و حرکات اور امور محسوسہ سے تھا مثلاً قیام و قعود رکوع و سجود، تلاوت و تسبیح، اذکار و ادعیہ، احکام و مناسک، فن حدیث نے اس کی روایت اور تدوین کی خدمت انجام دی، علم فقہ نے اس سے مسائل و جزئیات استخراج کرنے کا بیڑا اٹھایا، اور محدثین اور فقہاءِ امت نے (اللہ تعالےٰ ان کو اس کارِ عظیم کا بہترین صلہ عطا فرمائے) دین کو اس طرح محفوظ کر دیا کہ امت کے لئے اس پر عمل پیرا ہونا آسان ہو گیا۔

دوسری قسم وہ ہے، جس کا تعلق ان باطنی کیفیات سے ہے، جو ان افعال و حرکات کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں، اور جو رسول اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں قیام و قعود، رکوع و سجود، ذکر ودعا، وعظ و نصیحت، گھر کے ماحول، میدان جہاد غرض ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہیں، ان کیفیات کی تعبیر ہم اخلاص و احتساب، صبر و توکل، زہد و استغنا، ایثار و سخاوت، ادب و حیاء خشوع و خضوع، انابت و تضرع، دعا کے وقت دل شکستگی، دنیا پر آخرت کو ترجیح، رضائے الٰہی اور دیدار کا شوق، اور اس طرح کی اور دوسری باطنی کیفیات، اور ایمانی اخلاق سے کر سکتے ہیں، جن کی حیثیت جسم انسانی میں روح کی اور ظاہر میں باطن کی ہے ـــــ پھر ان عنوانات کے تحت اور بہت سی جزئیات اور آداب و احکام ہیں، جنھوں نے اس کو ایک مستقل علم اور علیحدہ فقہ کا درجہ دے دیا ہے، چنانچہ اگر اس علم کو جو اول الذکر کی شرح و تفسیر سے متعلق ہے، فقہ ظاہر کہا جاسکتا ہے، تو وہ علم جو ان کیفیات کی تشریح کرتا اور ان کے حصول کے لئے رہنمائی کرتا ہے، "فقہ باطن" قرار دیا جاسکتا ہے۔

زیادہ مناسب تو یہ تھا کہ ہم اس علم کو جس کا کام تزکیۂ نفوس اور تہذیب اخلاق ہے، اور جو نفس انسانی کو فضائل شرعیہ سے آراستہ اور نفسانی و اخلاقی رذائل سے پاک و صاف کرتا ہے، اور کمالِ ایمان و درجۂ احسان، اخلاق نبوی کی پیروی، روحانی و باطنی کیفیات میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع و تقلید کی دعوت دیتا ہے، "تزکیہ" یا "احسان" ہی کے نام سے یاد کرتے یا کم از کم فقہ باطن ہی کہتے، اگر ایسا ہوتا تو شاید اختلاف و نزاع کی نوبت ہی نہ آتی، اور سارا جھگڑا ختم ہو جاتا، اور دونوں فریق جن کو محض اصطلاح نے ایک دوسرے سے برسر نزاع کر رکھا ہے، مصالحت پر آمادہ ہو جاتے۔

احسان اور فقہ باطن سب علمی و شرعی حقائق اور دین کے مسلمہ اصول ہیں، جو کتاب و سنت

سے ثابت ہیں، اگر اہل تصوف اس مقصد کے حصول کے لئے (جس کو ہم تزکیۂ و احسان سے تعبیر کرتے ہیں) کسی خاص اور متعین راستے یا شکل پر اصرار نہ کرتے (اس لئے کہ زمان و مکان اور نسلوں کے مزاج اور ماحول کے ساتھ اصلاح و تربیت کے طریقے اور ان کے نصاب بھی بدلتے رہتے ہیں) اور وسیلہ کے بجائے مقصد پر زور دیتے تو اس مسئلہ میں آج سب یک زبان ہوتے، اور اختلاف کا سررشتہ ہی باقی نہ رہتا، سب دین کے اس شعبہ اور اسلام کے اس رکن کا جس کو ہم تزکیہ یا احسان یا فقہ باطن کہتے ہیں، صاف اقرار کرتے، اور اس بات کو بلا تامل قبول کرتے کہ وہ شریعت کی روح دین کا لُبّ لباب اور زندگی کی بنیادی ضرورت ہے، اور یہ کہ جب تک اس شعبہ کی طرف کما حقہ، توجہ نہ کی جائے، اس وقت تک کمالِ دین حاصل نہیں ہو سکتا، اور اجتماعی زندگی کی بھی اصلاح نہیں ہو سکتی، اور نہ صحیح معنی میں زندگی کا لطف آسکتا ہے۔

اس صورتِ حال سے ہم کو اندازہ ہوتا ہے کہ اس اصطلاح "تصوف" نے دین کی کتنی عظیم، کتنی روشن اور کتنی اہم حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے، اور بہت سے لوگوں کی راہ میں اس حقیقت کے حصول میں مانع بن گیا ہے، بلکہ بہت سے لوگ تو ہمت ہی ہار بیٹھے اور اس کا خیال ہی ترک کر دیا، لیکن اس کے بہت سے وجوہ اور تاریخی اسباب ہیں، جن کا ذکر اس موقع پر کرنا مشکل ہے، بہر حال واقعات ہمیشہ انسان کی خواہش کے تابع نہیں ہوتے، اب ہم کو فراخ دلی کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہئے، اور قیود و اصطلاحات اور خواہشات اور تعصبات سے آزاد ہو کر سوچنا چاہئے ایسا نہ ہو کہ ہم ایک دینی حقیقت سے (جو شریعت کے مسلمات میں سے ہے، اور کتاب و سنت اس کی دعوت دیتے ہیں، اور انسانی معاشرہ کو بھی اس کی شدید احتیاج ہے) محض ایک نئی اصطلاح اور ایک مروج نام کی وجہ سے گریز اختیار کرنے لگیں۔

اس کے علاوہ دوسری چیز جس نے اس دینی حقیقت کو اور زیادہ غبار آلود کر دیا،

وہ پیشہ ور اور جاہ طلب "حقیقت فروش" اور الحاد شعار اور فاسد العقیدہ نام نہاد صوفی ہیں، جنھوں نے دین میں تحریف کرنے، مسلمانوں کو گمراہ کرنے، معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے، آزادی وبے قیدی کی تبلیغ کرنے کے لئے تصوف کو آلۂ کار بنایا اور اس کے محافظ اور علمبردار بن کر لوگوں کے سامنے آئے، نتیجہ یہ ہوا کہ اہل غیرت اور اہل حمیت مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ان سے بدظن ہوگئی، کچھ غیر محقق صوفی ایسے تھے جو اس شعبہ کی روح اور اس کے حقیقی مقاصد سے ناآشنا تھے، وہ مقصد اور وسیلہ میں تمیز نہ کرسکے، بعض اوقات انھوں نے وسائل پر تو بہت اصرار کیا اور مقاصد کو نظر انداز کر دیا، اور اس شعبہ یا اس فن میں ایسی چیزیں داخل کیں، جن کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا، اور اس کو فن کی روح اور فن کا کمال قرار دیا بلکہ مقصود و مطلوب سمجھ بیٹھے، غرض کہ اس طرح انھوں نے مسئلہ کو اور پیچیدہ بنا دیا اور اس نزاع کو مختصر کرنے کے بجائے اور طول دے دیا، انھوں نے ان چیزوں کو جن کا مکلف ہر مسلمان ہے، اور جو دین کی روح اور زندگی کی ضرورت ہیں، معمہ فلسفہ اور رہبانیت بنا کر پیش کیا، جن کی ہمت صرف وہی شخص کر سکتا تھا، جو ترک دنیا اور مادی اسباب سے کنارہ کشی کا فیصلہ کر چکا ہو، اور دنیا کی ساری نعمتوں سے دستبردار ہونا چاہتا ہو، ظاہر ہے کہ ایسے لوگ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں بہت کم ہیں، اس سے بڑھ کر یہ کہ یہ نہ دین کا مطالبہ تھا، نہ رسول کی سنت نہ تخلیق انسانی کی حکمت۔

اسی کے ساتھ اللہ تعالےٰ نے ہر دور اور ہر ملک میں ایسے لوگ بھی پیدا کر دیئے جو دین کو مبالغہ کرنے والوں کی تحریف، باطل پرستوں کی غلط بیانیوں اور جاہلوں کی تاویلات سے پاک وصاف اور عجمیت اور فلسفہ سے محفوظ کرتے رہے، بغیر کسی تاویل یا تحریف کے خالص تزکیہ کی دعوت دیتے رہے، جس کا نام احسان اور فقہ باطن ہے، انھوں نے اس "طب نبوی" کی ہر زمانہ میں تجدید کا فرض انجام دیا، وہ امت اسلامیہ میں نئی روح اور نیا ایمان پیدا

کرتے رہے، بندوں کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ، معاشرہ کا تعلق اخلاق کے ساتھ، علما کا تعلق للّٰہیت اور اخلاص کے ساتھ استوار کرتے رہے، ایک طرف وہ عوام میں خواہش نفس، دنیا پرستی اور مال و اولاد کے فتنہ کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کرتے رہے... دوسری طرف انھوں نے خواص میں وہ ایمان و یقین اور روحانی قوت پیدا کی جس نے بادشاہوں کے انعامات اور تازیانے دونوں کا مقابلہ کیا، اور ان کے وعدوں اور ان کی تعزیروں کا مقابلہ کرنے، جابر بادشاہوں اور حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق کہنے، امراء اور بادشاہوں کا احتساب کرنے، اور مادی مظاہر کی بے وقعتی اور کفاف پر قناعت کی طاقت و صلاحیت پیدا کرتے رہے اور تاریخ میں ایسی مثالیں نظر آئیں کہ ایک بزرگ سے بادشاہ کی خوشنودی کی خاطر اس کی دست بوسی کرنے کو کہا گیا، تو انھوں نے جواب دیا کہ "خدا کی قسم میں تو اس پر بھی راضی نہیں کہ وہ میرا ہاتھ چومے نہ یہ کہ میں اس کا ہاتھ چوموں" اے لوگو! تم ایک دوسری دنیا میں ہو اور میں ایک دوسرے عالم میں ہوں[1]۔

بعض لوگوں کو بادشاہوں نے اپنے ملک میں بڑی سے بڑی پیشکش کی لیکن انھوں نے اس کا جواب یہ دیا کہ:-

اللہ تعالیٰ اس دنیا کا (باوجود اس کے طول و عرض کے) بڑی حقارت اور ذلت کے ساتھ ذکر کرتا ہے، "قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ" اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس چھوٹے سے ٹکڑے میں سے ایک اور چھوٹا سا ٹکڑا عطا فرمایا ہے، اب میں اس میں بھی حصہ لگاؤں؟ یہ مجھے پسند نہیں[2]!

ایک بزرگ ایک امیر کے سامنے پیر پھیلا کر بیٹھے تھے، جب وہ امیر واپس ہوئے تو انھوں نے اشرفیوں کی ایک تھیلی ان کی خدمت میں بھجوائی، انھوں نے یہ کہہ کر اس کو لینے سے انکار کر دیا کہ

---

[1] یہ مقولہ شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام (متوفی ۶۶۰ھ) کا ہے۔ [2] یہ بات مرزا مظہر جان جاناں دہلویؒ نے فرمائی تھی۔

جو اپنا پیر پھیلاتا ہے، وہ اپنا ہاتھ نہیں پھیلاتا۔"[1]

ہر زمانہ میں ایسی طاقتور شخصیتوں اور جامع کمالات داعیوں کی ضرورت رہی ہے جو مسلمانوں میں تلاوت آیات، تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیۂ نفوس کا کام کریں[2]۔

وہ انقطاع نبوت کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نیابت کا فرض انجام دیں اور امت اسلامیہ کا رشتہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جوڑ سکیں، اور اس میثاق و عہد کی تجدید کریں جو کلمہ اور ایمان کے ذریعہ ہر مسلمان نے کیا ہے' اور اطاعت و فرمانبرداری، نفس اور شیطان کی مخالفت، اپنے معاملات میں خدا اور رسول کی عدالت سے فیصلہ کرانے، طاغوت کے انکار اور اللہ کی راہ میں مجاہدہ اور اس عہد کی تجدید اپنا شعار بنائیں جو انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا، اس لئے کہ خلافت راشدہ کے بعد خلفاء و سلاطین اسلام نے اس کام کو فراموش کر کے صرف فتوحات ٹیکس اور جزیہ کی وصولیابی اور اپنے اور اپنی اولاد کے لئے بیعت خلافت کے انعقاد سے دلچسپی باقی رکھی تھی، علماء بھی اصلاح سے عاجز تھے، وہ وعظ و نصیحت، درس و تدریس، تصنیف و تالیف میں ایسے منہمک تھے کہ کسی اور چیز کو سوچنے کی بھی انھیں فرصت نہ تھی، اس کے علاوہ اگر یہ اس کا ارادہ بھی کرتے تو بھی یہ بات ان کے بس کی نہ تھی، اس لئے کہ ان کی زندگی عوام کے سامنے تھی، اور وہ جانتے تھے کہ ان میں زہد و اخلاص اور خلافت نبوت کے علامات اور اثرات کتنے کم اور شاذونادر نظر آتے ہیں، غرض کہ اس طرح عام اور خاص ہر طبقہ میں دینی شعور اور دینی حس کمزور اور مضمحل ہوتی رہی' اور رفتہ رفتہ وہ یہ بھولنے لگے کہ اسلام درحقیقت بندہ اور اس کے رب کے درمیان عہد و میثاق اور بیع و شرا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے تصرفات میں بالکل آزاد ہو گئے، اور خواہش نفس کو بالکل چھوٹ دے دی' ان کی حالت بھیڑ کے اس گلہ کی سی ہو گئی

---

[1] دمشق کے عالم شیخ سعید الحلبی جو گذشتہ صدی کے بزرگ ہیں۔ [2] هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ (الجمعہ)

جس کا نہ کوئی چوپاں ہو نہ مقصد اعبادت کا شوق، درجہ احسان، اور حلاوت ایمان کے حصول کا جذبہ سرد پڑنے لگا، ہمتیں پست ہو گئیں، عزائم خوابیدہ ہو گئے، اور عام طور پر لوگ (سوائے ان کے جن کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا) بہت بیتابی اور جنون کے ساتھ لذات اور خواہشات پر ٹوٹ پڑے۔

آخر کار اسلامی خلافت میں روح خلافت اور امانت نبوت کا خاتمہ ہو گیا، اور وہ حکومت و سیاست بن کر رہ گئی جس کا کام صرف ٹیکس وصول کرنا تھا، اس وقت وسیع اسلامی مملکت میں ہر طرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سچے نائب، اللہ کے مخلص بندے اور اہل حق کھڑے ہو گئے اور ان کی دعوت وصحبت کے اثر سے تمام لوگ اسلام کے میثاق وعہد میں از سر نو داخل ہونے لگے، وہ فہم وارادہ شعور واحساس کے ساتھ اس نئے عالم میں داخل ہو رہے تھے، جب کہ اسلام کو انھوں نے حادثاً اور وراثتہً قبول کیا تھا، اپنی تعلیم وتربیت سے انھوں نے ایمان اور لذت ایمانی کی تجدید کی، اور نفس کے تسلط، خواہشات کی اسیری، اور انسانوں کی غلامی سے آزاد ہو کر عبادات وطاعات، دعوت الی اللہ اور راہ حق میں جہاد کی طرف متوجہ ہو گئے۔

پھر ان کے جانشینوں اور شاگردوں میں اور ان سب لوگوں میں جنھوں نے دعوت میں ان کی پیروی کی، دعوت اسلامی کے ایسے علمبردار اور تربیت اسلامی کے امام فن (درمیانی اور آخری صدیوں میں) پیدا ہوئے جنھوں نے روح اسلامی اور شعلۂ ایمانی کی بقا وحفاظت، دعوت وجہاد کے شوق اور خواہشات وترغیبات کے مقابلہ کے میدان میں بہت اہم خدمات انجام دیں، اگر وہ نہ ہوتے تو مادیت جو حکومتوں اور تہذیبوں کے راستے سے حملہ آور تھی، پوری امت اسلامیہ پر اپنا تسلط جما لیتی، اور زندگی ومحبت کی چنگاری بالکل سرد پڑ جاتی، ان لوگوں کی وجہ سے ایسے دور دراز ملکوں میں جہاں اسلامی افواج اور مجاہدین کے قدم

نہیں پہونچے تھے، اسلام کی تبلیغ واشاعت ہوئی، ان کے ذریعہ سے اسلام کو افریقہ کے تاریک براعظم، انڈونیشیا، جزائر بحر الہند، چین اور ہندوستان میں فروغ حاصل ہوا۔[1]

اور پھر اس زمانہ اور ان مایوس کن حالات میں جب ساتویں صدی ہجری میں تاتاریوں نے عالم اسلام کو زیر وزبر کر دیا اور اس کو تاراج کر کے رکھ دیا، جہاد اور مقابلہ کی طاقت بالکل ختم ہو گئی، اور کسی میں ان کے سامنے آنے کی ہمت باقی نہیں رہ گئی، مایوس ہو کر مسلمانوں نے تلوار اپنے نیام میں رکھ لی، اور ان کو یقین ہو گیا کہ تاتاریوں کو شکست دینا ناممکن ہے، اور عالم اسلام کی تقدیر میں اس نیم وحشی قوم کی غلامی لکھ دی گئی ہے، اور اب اسلام کا کوئی مستقبل نہیں، اس وقت یہی مخلص دین کے داعی تھے، (جن میں سے اکثر کے نام تاریخ دعوت واصلاح کی دوربین اور عقابی نظر سے بھی اوجھل رہے) جو ان سخت دل اور سخت جان وحشی انسانوں میں گھسے اور ان کے دلوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ ان کے دلوں میں ان کی محبت اور قدر پیدا ہو گئی، اور پھر کثیر تعداد میں وہ لوگ اسلام قبول کرنے لگے، تاتاریوں کے اس غلبہ وکامرانی پر کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ ان کی بڑی تعداد اسلام کے آغوش میں آگئی، اور وہ اسلام کے پاسبان اور محافظ بن گئے اور ان میں بڑے بڑے فقیہ، عابد وزاہد، علماء اور مجاہد پیدا ہوئے۔[2]

ہے عیاں آج بھی تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو مسلم سوسائٹی بہت عرصہ ہوا

---

[1] دیکھئے کتاب "PREACHING OF ISLAM" مصنفہ سر ٹامس آرنلڈ۔

[2] تفصیل کے لئے دیکھئے "تاریخ دعوت وعزیمت" از مؤلف۔

دم توڑ چکی ہوتی، اور مادیت کی سرکش اور گرم لہر اس کے بچے کھچے ایمان و یقین کا خاتمہ کر دیتی، قلوب کا اللہ تعالیٰ سے، زندگی کا روحانیت سے، معاشرہ کا اخلاق سے رشتہ منقطع ہو جاتا، اخلاص و احتساب ختم ہو جاتا، اور باطنی امراض کی کثرت ہوتی، قلوب و نفوس کی بیماریاں پھیلتیں اور طبیب نہ ملتا، لوگ دنیا پر ٹوٹ پڑتے، اور اہل علم جاہ و منصب اور مال و دولت کے پیچھے دوڑتے، اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے، حرص و طمع کا ان پر کلی تسلط ہوتا، غرض کہ دین کا وہ شعبہ جو نبوت کے شعبوں میں ایک اہم شعبہ ہے، (یعنی تزکیۂ نفوس اور فقہ باطن) بالکل معطل ہو جاتا۔

ذرا ان ملکوں کی طرف نظر ڈالئے جہاں دعوت الی اللہ، روحانیت اور سچی خدا پرستی اور تزکیۂ نفوس کا کام عرصہ سے بند ہے، اور ایسے داعی اور علماء کی تعداد (جو انسانوں کا رشتہ خدائے تعالیٰ سے استوار کریں، اور ان کی اصلاح باطن کی طرف متوجہ ہوں) مغربی تہذیب کے اثر یا مغرب کے قرب یا اور دوسرے اسباب کی بنا پر بہت کم ہو گئی ہے، وہاں آپ ایک ایسا خلا پائیں گے، ایک مہیب اور طویل خلا، جس کو نہ وسعت علم اور تبحر علمی سے پُر کیا جا سکتا ہے، نہ ذہانت اور عالی دماغی سے، نہ ادب عالیہ سے، نہ عربی زبان و ادب سے گہرے ربط اور نسبی تعلق سے، نہ آزادی و حریت سے، یہ ایک ایسا روحانی و اخلاقی مسئلہ ہے جس کا کوئی حل نہیں اعلیٰ طبقہ کے لوگ اور عوام تیز اور ہمہ گیر مادیت، دولت کی اندھی محبت، اور دوسرے اجتماعی اور اخلاقی امراض کا شکار ہیں، تعلیم یافتہ اور ذہین لوگ، (مذہبی تعلیم و ثقافت ہو یا مادی) عہدہ و منصب، حسد اور بخل، تکبر اور انانیت، شہرت کی خواہش، نفاق اور مداہنت، مادہ اور طاقت سے مرعوبیت، جیسے باطنی امراض میں گرفتار ہیں، جہاں تک اجتماعی و سیاسی تحریکات کا سوال ہے، ان کو خود غرضی، تربیت کے فقدان اور لیڈروں کی کمزوری نے خراب

کردیا ہے، رہ گئے ادارے تو ان کو اختلافات، احساس ذمہ داری کی کمی، دنیا طلبی اور تنخواہوں میں اضافہ کے عشق نے بیکار کردیا ہے، اور وہ صرف اسی کام کے ہو کر رہ گئے ہیں۔

جہاں تک علماء کا تعلق ہے، ان کے وقار اور عزت کو مظاہر پرستی اور ظاہرداری، فقر سے ضرورت سے زائد اور بیجا خوف، آرام طلبی اور عیش پسندی نے بگاڑ دیا، اور ان سب چیزوں کا علاج اس تزکیۂ نبوی کے علاوہ جس کا ذکر قرآن میں ہے، اور جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد ہے، اور اس "ربانیت" میں جو علماء سے مطلوب ہے، اور کہیں نہیں، "وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ"

میں تزکیہ کی کسی خاص لگی بندھی اور متعین شکل پر زور نہیں دیتا، جس کا رواج عام ہوا، اور جس کا نام آخری دور میں تصوف پڑا، نہ میں تصوف کے حاملین میں سے سب کو ہر طرح کی غلط روی و غلط فہمی سے بری سمجھتا ہوں! اور نہ ان کو معصوم قرار دیتا ہوں، لیکن یہ ضروری ہے کہ اس خلا کو جو ہماری زندگی اور ہمارے معاشرہ میں واقع ہو گیا ہے، جلد پُر کیا جائے، اور تزکیۂ واحسان اور فقہ باطن کو پھر سے تازہ کیا جائے، جس طرح ہمارے اسلاف نے اس کو اپنے اپنے زمانہ میں تازہ کیا تھا، اور یہ سب منہاج نبوت اور کتاب اور سنت کی روشنی میں ہو، بہر حال ہر دور میں اور ہر جگہ جہاں مسلمان بستے ہوں، یہ کام ضروری ہے، اس لئے کہ حقیقت میں یہ خلا ایک عظیم خلا ہے، اور ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس کے اثرات اور نتائج بہت دور رس ہیں۔

اپنے اپنے دور میں اس ذمہ داری کو ادا کرنے والوں اور اس خدمت کے انجام دینے والوں پر تنقید کرنے والوں سے ایک عربی شاعر کی زبان میں کہنا چاہتا ہوں۔

اقلوا علیهم لا أبا لأبیــــکم

من اللوم أو سُدّوا المکان الذی سدّوا[1]

ان اللہ کے بندوں پر ملامت بہت ہو چکی، مسئلہ یہ ہے کہ کیا ان کی جگہ لینے والا اور درد کا مداوا کرنے والا کوئی ہے۔؟

---

[1] فراغ یجیب ان یملأ۔

تصوف وسلوک، ایک الہامی نظام

اللہ تعالیٰ نے اس امت کو اجتماعی الہام کی دولت سے نوازا ہے، جو ہر قسم کے خطرہ اور ضرر اور انفرادی کمزوریوں اور غلط فہمیوں سے پاک اور محفوظ ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب اسلام اور مسلمانوں کے سامنے کوئی نازک اور اہم مسئلہ آتا ہے، اور اس کے بارے میں فیصلہ کرنا اور کسی نتیجہ پر پہونچنا مشکل ہو جاتا ہے، یا زمانہ کے تغیر اور حالات کے تقاضہ سے کوئی نئی ضرورت سامنے آتی ہے تو اللہ تعالیٰ علماء و مخلصین کے ایک معتد بہ گروہ کے دل میں جو نفس زکی اور ارادۂ قوی کے مالک ہوتے ہیں، اس ضرورت کی تکمیل کا شدت سے خیال پیدا کر دیتا ہے، اور ہمہ تن ان کو اس طرف اس طرح متوجہ کر دیتا ہے کہ وہ اپنے کو اس کام کے لئے مامور اور عنداللہ مسئول سمجھنے لگتے ہیں، ان کو اس کام کی تکمیل میں کھلے طور پر تائید الٰہی اور نصرت غیبی نظر آتی ہے، اور وہ دل کی گہرائی سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اس کی طرف کشاں کشاں لے جائے جا رہے ہیں، یہ وہ حقیقت ہے، جس کو ہم نے "اجتماعی الہام" یا اجتماعی ہدایت سے تعبیر کیا ہے، اور تاریخ اسلام اس کی مثالوں سے پر ہے۔

کبھی یہ الہام معدودے چند اصحاب کو ہوتا ہے، جیسا کہ اذان کے واقعہ میں عبداللہ بن

زیدؓ اور حضرت عمر بن خطابؓ کے ساتھ پیش آیا کہ دونوں کے خواب یکساں نکلے، اور دونوں کو خواب میں کلمات اذان کی تلقین کی گئی، اور رسول اللہؐ نے ان کی تصویب فرمائی اور اذان کو شرعی حیثیت دے دی، جو آج تمام عالم اسلام میں رائج ہے[1]، اور جیسا کہ لیلۃ القدر کے سلسلہ میں پیش آیا، جس کے بارے میں شیخین نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ "چند صحابہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے جنھیں خواب میں لیلۃ القدر کو رمضان کی اخیر سات راتوں میں دکھایا گیا تھا، تو رسول اللہ نے فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے خواب سات آخری راتوں کے بارے میں یکساں ہیں تو جو اُسے تلاش کرنا چاہتا ہے، وہ انھیں سات راتوں میں تلاش کرے"!

اور اسی کے قریب صلوۃ تراویح کا معاملہ ہے، جس کی اصل نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، جسے آپ نے تین دن کے بعد اس خیال سے چھوڑ دیا تھا کہ یہ امت پر فرض نہ ہوجائے اور اس طرح مشقت کا سبب نہ بن جائے[2]، مسلمان اسے اکیلے اکیلے پڑھنے لگے، حضرت عمرؓ نے اس کی جماعت قائم کر دی، حضرت عمر کا یہ فعل الہام الٰہی پر مبنی اور آسمانی رہنمائی کا نتیجہ تھا، اور اس میں بڑا ہی خیر پوشیدہ تھا، اللہ تعالے نے مسلمانوں میں اس نماز کو باجماعت ادا کرنے کا خیال اور اس میں ختم قرآن کا شوق پیدا کر دیا، جو حفظ و حفاظت قرآن کا بڑا ذریعہ ثابت ہوا، اور اس کی وجہ سے مسابقت اور رمضان کی راتوں میں بیدار رہنے کا داعیہ پیدا ہوگیا، اس سلسلہ میں اہل سنت جنھوں نے تراویح کو اپنایا اور ان جماعتوں کے درمیان جنھوں نے اس کا انکار کیا اس کھلے فرق کو دیکھا جا سکتا ہے، جو حفظ قرآن

---

[1] ملاحظہ ہو وہ طویل حدیث جس کی ابوداؤد، ترمذی اور دارمی و ابن ماجہ نے تخریج کی ہے۔

[2] ملاحظہ ہو روایت بخاری عن عائشہؓ جو باب فضل من قام رمضان" میں نقل ہوئی ہے۔

کی کثرت اور اس کے مطالعہ واہتمام کے سلسلہ میں پایا جاتا ہے۔

اور کبھی یہ الہام مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اور جم غفیر کو ہوتا ہے جس کا کسی امر پر متفق یا کسی ضرورت کی طرف متوجہ ہو جانا محض اتفاقی واقعہ یا کسی سازش کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا، ان کی اس کوشش سے اسلام اور مسلمانوں کو نفع عظیم پہونچتا ہے، یا مسلمانوں کی زندگی کا کوئی خلا پُر ہوتا ہے، یا کسی مہیب فتنہ، یا رخنہ کا سدِ باب ہوتا ہے، یا دین کے عظیم مقاصد میں سے کوئی مقصد پورا ہوتا ہے۔

اس طرح کے مبارک اجتماعی الہام کی مثال (جو بے شمار راسخ العلم علماء اور مخلص و باعمل لوگوں کو ہوا) حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں قرآن کو مصاحف میں جمع کرنا اور قرن اول وثانی اور اس کے بعد کی ابتدائی صدیوں میں حدیث کے جمع وتدوین کا کام، مجتہدین کا استنباطِ احکام اور جزئیات فقہ کی تفریع، علم نحو وقرأت، اصول فقہ اور قرآن اور اس کی زبان کو محفوظ کرنے والے تمام مفید علوم کی تدوین اور مدارس کی تعمیر، کتابوں کی نشر واشاعت وغیرہ اس اجتماعی الہام کی بہترین مثالیں ہیں، جس کے ذریعہ دین اور امت کی یہ اہم ترین ضرورتیں پوری کی گئیں، اور آنے والے خطرات کا سدباب کیا گیا۔

اسی اجتماعی الہام کی ایک مثال گمراہ فرقوں، ملحدین ومشککین، تعطل وبے عملی کی دعوت دینے والے فلسفوں اور تخریب پسند تحریکوں کی تردید وابطال کا کام بھی ہے جس کے لئے مسلمانوں میں سے علم وذہانت، فکری صلاحیت اور ایمانی قوت میں امتیاز وتفوق رکھنے والے افراد میدان میں آئے، اور انھوں نے ان دعوتوں اور فلسفوں کو بے نقاب کر دیا، مسلمانوں کو ان کے برے اثرات سے بچا لیا، یہ سب کارنامے الہام ربانی کا کرشمہ ہیں جس سے تاریخ اسلام کے ہر مرحلہ اور علم وتہذیب کے ہر مرکز میں مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت مشرف و

سرفراز کی گئی، اور جو اس امت پر (جو آخری امت اور انسانیت کا مرکز امید ہے) خدا کی عنایت اور اللہ کے نزدیک اس کے بلندی مرتبہ کی دلیل ہے، اور یہ غیر منقطع الہام اور مسلسل مدد الٰہی، ختم نبوت اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد سلسلۂ وحی کے منقطع ہونے کی روشن دلیل ہے، جس کی اگلی امتوں میں کوئی واضح اور مسلسل نظیر نہیں ملتی، اس لئے کہ انھیں اس کی ضرورت بھی نہ تھی، کیونکہ سلسلہ نبوت قائم اور کار نبوت باقی تھا۔

تزکیۂ نفس و تہذیب اخلاق کا وسیع و مستحکم نظام جس نے بعد کی صدیوں میں ایک مستقل علم اور فن کی شکل اختیار کرلی، نفس و شیطان کے مکاید کی نشاندہی، نفسانی اور اخلاقی بیماریوں کا علاج، تعلق مع اللہ، اور نسبت باطنی کے حصول کے ذرائع وطرق کی تشریح و ترتیب جس کی اصل حقیقت تزکیہ و احسان کے ماثور و شرعی الفاظ میں پہلے سے تھی، اور جس کا عرفی و اصطلاحی نام بعد کی صدیوں میں "تصوف" پڑگیا، اسی اجتماعی الہام کی ایک درخشاں مثال ہے، رفتہ رفتہ اس فن کو اس کے ماہرین نے اجتہاد کے درجہ تک پہونچادیا، اور اس کو دین کی بڑی خدمت اور وقت کا جہاد قرار دیا، جس کے ذریعہ اللہ تعالےٰ نے قلوب و نفوس کی مردہ کھیتیوں کو زندہ کیا، اور روح کے مریضوں کو شفا دی، ان مخلص علماء ربانیین اور ان کے تربیت یافتہ اشخاص کے ذریعہ دنیا کے دور دراز گوشوں اور طویل و عریض ممالک (جیسے ہندوستان، جزائر شرق الہند اور براعظم افریقیہ) میں وسیع پیمانہ پر اسلام کی اشاعت ہوئی اور لاکھوں انسانوں نے ہدایت پائی، ان کی تربیت سے ایسے مردان کار پیدا ہوئے، جنھوں نے اپنے اپنے عہد میں مسلم معاشرہ میں ایمان و یقین اور عمل صالح کی روح پھونکی، اور بارہا میدان جہاد میں قائدانہ کردار ادا کیا، اس گروہ کی افادیت اور اس کی خدمات سے انکار یا تو وہ شخص کرے گا جس کی تاریخ اسلام پر نظر نہیں،

یا جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔

جیسا کہ حدیث متواتر کی تعریف اور اس کے قطعی الثبوت ہونے کی دلیل میں اہل اصول کہتے ہیں کہ "اتنی بڑی تعداد نے ہر زمانہ میں اس کی روایت کی ہو کہ عقل سلیم اور انسانی عادات اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوں کہ اتنے کثیر انسانوں نے غلط بیانی اور افترا پردازی پر اتفاق کر لیا ہے، اور یہ کسی سازش کا نتیجہ ہے[1]" تاریخ کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرن ثانی سے لے کر اس وقت تک بلا انقطاع اور بلا استثناء ہر دور اور ہر ملک کے خدا کے کثیر التعداد مخلص بندوں نے اسی طریقہ کو اختیار کیا، اور اس کی دعوت دی، خود فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو فائدہ پہونچایا، اور ساری زندگی اس کی اشاعت میں مشغول و سرگرم رہے، اور ان کو اس کی صحت و افادیت کے بارے میں پورا الیقین و اطمینان حاصل تھا، وہ اپنے ماحول و معاشرہ کا خلاصہ اور عطر تھے، اور نہ صرف اپنی راست بازی، خلوص و بے غرضی، پاک نفسی اور نیک باطنی میں، بلکہ کتاب و سنت کے علم، سنت کی محبت و عشق اور بدعات سے نفرت و کراہت میں بھی اپنے معاصرین میں فائق اور ممتاز تھے، ایک دو کا، یا دس پانچ کا کسی غلط فہمی یا سازش کا شکار ہو جانا ممکن ہے اور بعید از قیاس نہیں لیکن لاکھوں انسانوں کا جو اپنے علم و عمل میں بھی امت کی صف اول میں نظر آتے ہیں، علی سبیل التواتر صدیوں تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہنا، اس پر اصرار کرنا، اور اس کی دعوت دینا، اس پر پورے عزم و استقامت کے ساتھ قائم رہنا خلاف عقل اور خلاف عادت بات ہے، پھر ان کے انفاس قدسیہ سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کا ہدایت یافتہ اور فیض یاب ہونا اور اعلیٰ باطنی و روحانی کمالات تک پہونچنا خبر متواتر

---

[1] الخبر المتواتر ما یکون له طرق بلا عدد معین، تکون العادة قد احالت تواطؤهم علی الکذب (نخبة الفکر)

ہے، جس کا انکار ممکن نہیں، عقلاً و عادتاً یہ بات بالکل ناممکن معلوم ہوتی ہے کہ زمانی و مکانی اختلاف کے باوجود صادقین و مخلصین کا یہ گروہ عظیم متواتر و مسلسل طریقہ پر ایک غلط فہمی میں مبتلا رہا، اور اللہ تعالیٰ نے بھی جو رحیم و حکیم اور ہادیٔ مطلق ہے، اور جس کا وعدہ ہے کہ :۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝
(العنکبوت۔ ۶۹)

اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں بڑے بڑے مجاہدے اور کوششیں کیں ہم ان کو ضرور بالضرور اپنے صحیح راستوں پر لگادیں گے بیشک اللہ تعالیٰ ہمت و صداقت کے ساتھ کام کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ان کی اس غلط فہمی کا پردہ چاک نہیں کیا، اور ان کی دستگیری نہیں فرمائی، آپ تاریخ اسلام میں سے ان صادقین و مخلصین کو جن میں ایک ایک آدمی اپنے عہد کا گل سرسبد، منارۂ نور، اور نوع انسانی کے لئے شرف و عزت کا باعث ہے، نکال کر دیکھیں کہ ان کے بعد کیا رہ جاتا ہے، اور اگر ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تو پھر کون سی جماعت لائق اعتماد اور سرمایۂ افتخار ہوگی؟

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا اصلاحی و انقلابی کام

حضرت شیخ کا عہد اور ماحول

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے بغداد میں ۷۳ سال گزارے اور عباسی خلفاء میں سے پانچ ان کی نظروں کے سامنے یکے بعد دیگرے مسند خلافت پر بیٹھے جس وقت وہ بغداد میں رونق افروز ہوئے، اس وقت خلیفہ مستظہر بامر اللہ ابوالعباس (م ۵۱۲ھ) کا عہد تھا، ان کے بعد بالترتیب مسترشد، راشد، المقتفی لامر اللہ و المستنجد باللہ تخت سلطنت پر متمکن ہوئے۔

شیخ کا یہ عہد بہت اہم تاریخی واقعات سے لبریز ہے، سلجوقی سلاطین اور عباسی خلفاء کی باہمی کشمکش اس زمانے میں پورے عروج پر تھی، یہ سلاطین عباسی حکومت پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے دل وجان سے کوشاں تھے، کبھی خلیفہ کی رضامندی کے ساتھ اور کبھی اس کی مخالفت اور ناراضگی کے باوجود، کبھی کبھی خلیفہ اور سلطان کے لشکروں میں باقاعدہ معرکہ آرائی بھی ہوتی اور مسلمان ایک دوسرے کا بے دریغ خون بہاتے۔

اس طرح کے واقعات مسترشد کے زمانے میں کئی مرتبہ پیش آئے، یہ عہد عباسی کا سب سے زیادہ طاقتور اور معقول خلیفہ[1] تھا، اور اکثر معرکوں میں فتح بھی اسی کو حاصل

(۱؎ حاشیہ صفحہ ۲۳ پر ملاحظہ ہو)

ہوتی لیکن ۱۰ رمضان ۵۱۹ھ میں سلطان مسعود اور اس کے درمیان جو معرکہ ہوا اس میں اس کو شکست فاش ہوئی، ابن کثیر لکھتے ہیں :۔

" سلطان کے لشکر کو فتح حاصل ہوئی، خلیفہ کو قید کر لیا گیا، اہل بغداد کی املاک کو لوٹ لیا گیا، اور یہ خبر دوسرے تمام صوبوں میں پھیل گئی، بغداد اس المناک خبر سے بہت متاثر ہوا، اور وہاں کے باشندوں میں ظاہر و باطن ہر لحاظ سے ایک زلزلہ سا آ گیا، عوام نے مسجدوں کے ممبروں تک کو توڑ ڈالا، اور جماعتوں میں شریک ہونا بھی چھوڑ دیا، عورتیں سر سے دوپٹہ ہٹا کر نوحہ خوانی کرتی ہوئی باہر نکل آئیں، اور خلیفہ کی قید اور اس کی پریشانیوں اور مصیبتوں کا ماتم کرنے لگیں، دوسرے علاقے بھی بغداد ہی کے نقش قدم پر چلے، اور اس کے بعد یہ فتنہ اتنا بڑھا کہ کم و بیش تمام علاقے اس سے متاثر ہو گئے، ملک سنجر نے یہ ماجرا دیکھ کر اپنے بھتیجے کو معاملہ کی نزاکت اور اہمیت سے آگاہ اور خبردار کیا اور اس کو حکم دیا کہ خلیفہ کو بحال کر دے، ملک مسعود نے اس حکم کی تعمیل کی، لیکن خلیفہ کو باطنیوں نے بغداد کے راستے میں قتل کر دیا"

یہ تمام الم انگیز واقعات شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی نگاہوں کے سامنے گذرے، انھوں نے مسلمانوں کے باہمی افتراق اور خانہ جنگی اور دشمنی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ دنیا کی محبت کی خاطر اور ملک و سلطنت اور جاہ و مرتبہ کے

(حاشیہ صفحہ ۳۲ کا) ابن کثیر نے اس کے مناقب میں لکھا ہے کہ مسترشد بہت ہی شجاع، حوصلہ مند، فصیح و بلیغ، شیریں کلام ..... اور بہت عبادت گذار خلیفہ تھا، اور خاص و عام سب کی نظروں میں محبوب تھا، وہ آخری خلیفہ تھا جس نے خطبہ دینے کی رسم برقرار رکھی، ۴۵ سال ۳ ماہ کی عمر میں اس کو شہید کر دیا گیا، اس کی مدت خلافت ۱۷ سال اور ۲۰ روز ہے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۲۰۵)

حصول کے لئے لوگ سب کچھ کر گذرنے پر آمادہ ہیں، اور ان کو صرف دربار کی شان و شوکت سے دلچسپی باقی رہ گئی ہے، وہ اہل سلطنت کو تقدس کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں، اور صوبوں اور شہروں کی حکومت حاصل کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا مادی وجود خواہ ان واقعات سے علیحدہ اور دور رہا ہو لیکن اپنے شعور اور احساس کے ساتھ وہ اسی آگ میں جل رہے تھے، اور اسی سوزِ دروں نے ان کو پوری ہمت و طاقت اور اخلاص کے ساتھ وعظ و ارشاد، دعوت و تربیت، اصلاح نفوس اور تزکیۂ قلوب کی طرف متوجہ کیا، اور انھوں نے نفاق اور حب دنیا کی تحقیر و تذلیل، ایمانی شعور کے احیاء، عقیدۂ آخرت کی تذکیر، اور اس سرائے فانی کی بے ثباتی کے مقابلہ میں اس حیاتِ جاودانی کی اہمیت، تہذیب اخلاق، توحید خالص اور اخلاص کامل کی دعوت پہ سارا زور صرف کر دیا۔

مواعظ و خطبات

حضرت شیخ کے مواعظ دلوں پر بجلی کا اثر کرتے تھے، اور وہ تاثیر آج بھی آپ کے کلام میں موجود ہے "فتوح الغیب" اور "الفتح الربانی" کے مضامین اور آپ کی مجالسِ ... وعظ کے الفاظ آج بھی دلوں کو گرماتے ہیں، ایک طویل مدت گذر جانے کے بعد بھی ان میں زندگی اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے تابعین اور عارفین کاملین کے کلام کی طرح یہ مضامین بھی ہر وقت کے مناسب اور سامعین اور مخاطبین کے حالات اور ضروریات کے مطابق ہوتے تھے، عام طور پر لوگ جن بیماریوں میں مبتلا، اور جن مغالطوں میں گرفتار

تھے، انھیں کا ازالہ کیا جاتا تھا، اسی لئے حاضرین آپ کے ارشادات میں اپنے زخم کا مرہم، اپنے مرض کی دوا، اور اپنے سوالات و شبہات کا جواب پاتے تھے، اور تاثیر اور عام نفع کی یہ ایک بڑی وجہ تھی، پھر آپ زبان مبارک سے جو فرماتے تھے، وہ دل سے نکلتا تھا، اس لئے دل پر اثر کرتا تھا، آپ کے کلام میں بیک وقت شوکت و عظمت بھی ہے، اور دل آویزی اور حلاوت بھی، اور صدیقین کے کلام کی یہی شان ہے۔

توحید خالص اور غیر اللہ کی بے حقیقتی

اس وقت ایک عالم کا عالم اہل حکومت اور اہل دولت کے دامن سے وابستہ تھا، لوگوں نے مختلف انسانوں اور مختلف ہستیوں کو نفع و ضرر کا مالک سمجھ لیا تھا، اسباب کو ارباب کا درجہ دے دیا گیا تھا، اور قضا و قدر کو بھی اپنے جیسے انسانوں سے متعلق سمجھ لیا گیا تھا، ایک ایسی فضا میں حضرت شیخ فرماتے ہیں:۔

"کل مخلوقات کو اس طرح سمجھو کہ بادشاہ نے جس کا ملک بہت بڑا اور حکم سخت اور رعب وداب دل ہلا دینے والا ہے، ایک شخص کو گرفتار کر کے اس کے گلے میں طوق اور پیروں میں کڑا ڈال کر ایک صنوبر کے درخت میں ایک نہر کے کنارے جس کی موجیں زبردست اور پاٹ بہت بڑا تھا، .... لٹکا دیا ہے، اور خود ایک نفیس اور بلند کرسی پر کہ اس تک پہنچنا مشکل ہے، تشریف فرما ہے، اور اس کے پہلو میں تیر و پیکان، نیزہ و کمان اور ہر طرح کے اسلحہ کا انبار ہے جن کی مقدار خود بادشاہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اب ان میں سے جو چیز چاہتا ہے اٹھا کر اس لٹکے ہوئے قیدی پر

چلاتا ہے تو کیا یہ تماشا دیکھنے والے کے لئے بہتر ہوگا کہ وہ سلطان کی طرف سے نظر اٹھالے اور اس سے خوف اور امید ترک کردے، اور لٹکے ہوئے قیدی سے امید و بیم رکھے کیا جو شخص ایسا کرے، عقل کے نزدیک بے عقل، بے ادراک، دیوانہ، چوپایہ اور انسانیت سے خارج نہیں ہے، خدا کی پناہ بینائی کے بعد نابینائی، اور وصول کے بعد جدائی و قرب و ترقی کے بعد تنزل اور ہدایت کے بعد گمراہی اور ایمان کے بعد کفر سے[1]"

ایک دوسری مجلس میں توحید و اخلاق اور ماسوا اللہ سے انقطاع کی تعلیم اس طرح دیتے ہیں:۔

"اس پر نظر رکھو جو تم پر نظر رکھتا ہے، اس کے سامنے رہو جو تمہارے سامنے رہتا ہے، اس سے محبت کرو جو تم سے محبت کرتا ہے، اس کی بات مانو جو تم کو بلاتا ہے، اپنا ہاتھ اسے دو جو تم کو گرنے سے سنبھال لے گا، اور تم کو جہل کی تاریکیوں سے نکال لے گا اور ہلاکتوں سے بچائے گا، نجاستیں دھو کر میل کچیل سے پاک کرے گا، تم کو تمہاری سڑاہند اور بدبو اور پست ہمتی، نفس بدکار، ورفیقان گمراہ و گمراہ کن سے نجات دے گا، جو شیاطین کی خواہشیں اور تمہارے جاہل دوست ہیں، خدا کی راہ کے رہزن اور تم کو ہر نفیس اور ہر عمدہ پسندیدہ چیز سے محروم رکھنے والے، کب تک عادت؟ کب تک خلق؟ کب تک خواہش؟ کب تک رعونت؟ کب تک دنیا؟ کب تک آخرت؟ کب تک ماسوائے حق؟ کہاں چلے تم؟ (اس خدا کو چھوڑ کر جو) ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے، اور بنانے والا ہے، اول ہے، آخر ہے، ظاہر ہے، باطن ہے، دلوں کی محبت، روحوں کا اطمینان، گرانیوں سے سبکدوشی، بخشش واحسان، ان سب کا رجوع اسی کی طرف سے، اور اسی کی طرف سے اس کا صدور ہے۔[2]"

---

[1] بہجۃ الغیب ترجمہ فتوح الغیب مقالہ (۱۷) [2] ایضاً (۶۲)

ایک دوسری مجلس میں اسی توحید کے مضمون کو اس طرح واشگاف بیان فرماتے ہیں:۔

"ساری مخلوق عاجز ہے، نہ کوئی تجھ کو نفع پہنچا سکتا ہے، نہ نقصان، بس حق تعالےٰ اس کو ان کے ہاتھوں کرا دیتا ہے، اسی کا فعل تیرے اندر اور مخلوق کے تصرف فرماتا ہے، جو کچھ تیرے لئے مفید یا مضر ہے، اس کے متعلق اللہ کے علم میں قلم چل چکا ہے، اس کے خلاف نہیں ہو سکتا، جو موحد اور نیکوکار ہیں، وہ باقی مخلوق پر اللہ کی حجت ہیں، بعض ان میں سے ایسے ہیں جو ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے دنیا سے برہنہ ہیں، گو دولت مند ہیں، مگر حق تعالےٰ ان کے اندرون پر دنیا کا کوئی اثر نہیں پاتا، یہی قلوب ہیں جو صاف ہیں، جو شخص اس پر قادر ہوا اس کو مخلوقات کی بادشاہت مل گئی، وہی بہادر پہلوان ہے، بہادر وہی ہے جس نے اپنے قلب کو ماسولٰے اللہ سے پاک بنایا، اور قلب کے دروازے پر توحید کی تلوار اور شریعت کی شمشیر لے کر کھڑا ہو گیا کہ مخلوقات میں سے کسی کو بھی اس میں داخل نہیں ہونے دیتا، اپنے قلب کو مقلب القلوب سے وابستہ کرتا ہے، شریعت اس کے ظاہر کو تہذیب سکھاتی ہے، اور توحید و معرفت باطن کو مہذب بناتی ہیں۔"[1]

معبودانِ باطل کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"آج تو اعتماد کر رہا ہے اپنے نفس پر، مخلوق پر، اپنے دیناروں پر، اپنے درہموں پر، اپنی خرید و فروخت پر، اور اپنے شہر کے حاکم پر، ہر چیز کہ جس پر تو اعتماد کرے، وہ تیرا معبود ہے، اور ہر وہ شخص جس سے تو خوف کرے یا توقع رکھے، وہ تیرا معبود ہے، اور ہر وہ شخص جس پر نفع اور نقصان کے متعلق تیری نظر پڑے، اور تو یوں سمجھے کہ حق تعالےٰ ہی اس کے ہاتھوں اس کا جاری کرنے والا ہے تو وہ تیرا معبود ہے۔"[2]

---

[1] فیوض یزدانی ترجمہ الفتح الربانی مجلس (۱۳) [2] ایضاً مجلس (۲۰)

ایک دوسرے موقع پر خدا کی غیرت، شرکا سے نفرت اور انسان کی محبوب چیزوں کے سلب اور ضائع ہو جانے کی حکمت اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

"تم اکثر کہتے ہو گے اور کہو گے میں جس سے محبت کرتا ہوں، اس سے میری محبت رہنے نہیں پاتی، اور رخنہ پڑ جاتا ہے، یا تو جدائی ہو جاتی ہے، یا وہ مر جاتا ہے، یا رنجش ہو جاتی ہے، اور مال سے اگر محبت کرتا ہوں تو وہ ضائع ہو جاتا ہے، اور ہاتھ سے نکل جاتا ہے، تب تم سے کہا جائے گا کہ اے خدا کے محبوب، اے وہ کہ جس پر خدا کی عنایت ہے، اے وہ جو خدا کا منظور نظر ہے، اے وہ جس کے لئے اور جس پر خدا کی غیرت آتی ہے، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ غیور ہے، اس نے تم کو اپنے لئے پیدا کیا، اور تم غیر کے ہو رہنا چاہتے ہو، کیا تم نے خدا کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ "وہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے، اور وہ اسے" اور یہ ارشاد کہ "میں نے جن و انس کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں"؟ کیا تم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ "خدا جب کسی بندہ سے محبت کرتا ہے، تو اسے مبتلا کرتا ہے، پھر اگر وہ صبر کرتا ہے تو اسے رکھ چھوڑتا ہے، عرض کیا کہ یا رسول اللہ! رکھ چھوڑنے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا "اس کے مال و اولاد کو باقی نہیں رکھتا" اور یہ معاملت اس لئے ہے کہ جب مال و اولاد ہوں گے تو اسے ان کی محبت بھی رہے گی، اور خدا سے جو محبت اسے ہے، متفرق اور ناقص اور تقسیم ہو کر حق اور غیر حق میں مشترک ہو جائے گی، اور خدا شریک کو قبول نہیں کرتا، وہ غیور ہے اور ہر چیز پر غالب اور زبردست، تو وہ اپنے شریک کو ہلاک اور معدوم کر دیتا ہے، تاکہ وہ اپنے بندے کے دل کو خالص کر لے، خاص اپنے لئے بغیر کسی شریک کے، اس وقت اس کا یہ ارشاد صادق آجاتا ہے کہ "وہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے، اور وہ

لوگ اسے" یہاں تک کہ دل جب (خدا کے ان مصنوعی) شریکوں اور برابری کرنے والوں سے جو اہل وعیال، دولت ولذت اور خواہشیں ہیں، نیز ولایت وریاست، کرامات وحالات منازل ومقامات، جنتوں اور درجات اور قرب ونزدیکی کی طلب سے پاک وصاف ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی ارادہ اور آرزو باقی نہیں رہتی، اور وہ مثل سوراخ دار برتن کے ہو جاتا ہے، جس میں کوئی چیز نہیں ٹھہرتی، کیونکہ وہ خدا کے فعل سے ٹوٹ جاتا ہے، جب اس میں کوئی ارادہ پیدا ہوتا ہے، خدا کا فعل اور اس کی غیرت اس کو توڑ ڈالتی ہے تب اس کے گرد عظمت وجبروت وہیبت کے پردے ڈال دیئے جاتے ہیں، اور اس کے گردا گرد کبریائی اور سطوت کی خندقیں کھودی جاتی ہیں کہ دل میں کسی چیز کا ارادہ گھسنے نہیں پاتا، اس وقت دل کو اسباب یعنی مال اور اہل وعیال واصحاب، وکرامات وحکم وبیانات کچھ مضر نہیں ہوتے کیونکہ یہ سب دل سے باہر رہتے ہیں، تب اللہ تعالٰے ان سے غیرت نہیں کرتا بلکہ یہ سب چیزیں خدا کی طرف سے بندہ کے لئے بطور لطف وکرامت ورزق ونعمت کے ہوتی ہیں، اور جو لوگ اس کے پاس آتے ہیں انھیں نفع پہنچانے کے لئے۔"[1]

شکستہ دلوں کی تسکین

حضرت شیخ کے زمانے میں ایک طبقہ ایسا تھا، جو اپنے اعمال واخلاق اور ایمانی کیفیت کے لحاظ سے پست لیکن دنیاوی حیثیت سے بلند اور ہر طرح سے اقبال مند تھا، اس کے برخلاف دوسرا طبقہ معاشی حیثیت سے پست، دنیاوی ترقیات سے محروم بے بضاعت وتہی دست، لیکن اعمال واخلاق کے لحاظ سے بلند اور ایمانی کیفیات وترقیات

---

[1] رموز الغیب مقالہ (۳۲)

سے بہرہ مند تھا، وہ پہلے طبقہ کی کامیابیوں اور ترقیات کو بعض اوقات رشک کی نگاہ سے دیکھتا، اور اپنے کو کسی وقت محروم و نامراد سمجھنے لگتا تھا، حضرت شیخ اس شکستہ دل طبقہ کی دلجوئی فرماتے ہیں، اور ان پر اللہ تعالٰی کی جو عنایات ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے اس امتیاز و فرق کی حکمت بیان کرتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے :۔

"اے خالی ہاتھ فقیر، اے وہ جس سے تمام دنیا برگشتہ ہے، اے گمنام اے بھوکے پیاسے ننگے، جگر جھلسے ہوئے، اے ہر مسجد و خرابات سے نکالے ہوئے اور اے ہر در سے پھٹکارے ہوئے، اے وہ کہ ہر مراد سے محروم خاک پر پڑا ہے، اے وہ کہ جس کے دل میں (مٹی ہوئی) آرزوؤں اور ارمانوں کے (کشتوں کے) پشتے لگے ہیں، مت کہہ کہ خدا نے مجھ کو محتاج کر دیا، دنیا کو مجھ سے پھیر دیا، مجھے پامال کر دیا، چھوڑ دیا، مجھ سے دشمنی کی، مجھے پریشان کیا اور جمعیت (خاطر) نہ بخشی، مجھے ذلیل کیا اور دنیا سے میری کفایت نہ کی، مجھے گمنام کیا، اور خلق میں اور میرے بھائیوں میں میرا ذکر بلند نہ کیا، اور غیر پر اپنی تمام نعمتیں نچھاور کر دیں، جس میں اس کے رات دن گذرتے ہیں، اسے مجھ پر اور میرے دیار والوں پر فضیلت دی، حالانکہ وہ بھی مسلمان ہے، اور میں بھی، اور ایک ماں باپ آدم و حوا کی اولاد میں دونوں ہیں، (اے فقیر) خدا نے تیرے ساتھ یہ برتاؤ اس لئے کیا ہے کہ تیری سرشت ٹمیار زمین (کے مثل) بے ریت ہے، اور رحمتِ حق کی بارشیں برابر تجھ پر ہو رہی ہیں، از قسم صبر و رضا و یقین وافقت و علم اور ایمان و توحید کے انوار تیرے گرداگرد ہیں، تو تیرے ایمان کا درخت اور اس کی جڑ اور بیخ اپنی جگہ پر مضبوط ہے، کلّے دے رہا ہے، پھل رہا ہے، بڑھ رہا ہے، شاخیں پھیلا رہا ہے، سایہ دے رہا ہے، بلند ہو رہا ہے، روزانہ زیادتی اور نمو میں ہے، اس کے بڑھانے اور پرورش کرنے میں پانس اور کھاد دینے کی ضرورت نہیں، اس بارہ میں خداوند تعالٰے

تیرے حکم سے فارغ ہے (کہ وہ خود تیری ضروریات کو بخوبی جانتا ہے) اس نے آخرت میں تجھ کو مقام بخشا ہے، اور اس میں تجھ کو مالک بنایا ہے، اور عقبیٰ میں تیرے لئے اتنی کثرت سے بخششیں رکھی ہیں کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھیں نہ کسی کان نے سنی، نہ کسی انسان کے دل میں گذریں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ کوئی نفس نہیں جانتا کہ کونسی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لئے چھپا رکھی گئی ہے، اس کام کے بدلہ میں جو کرتے رہے ہیں، یعنی جو کچھ دنیا میں ان لوگوں نے احکام کی بجاآوری، ممنوعات کے ترک پر صبر، مقدرات میں تفویض و تسلیم اور کل امور میں خدا کی موافقت کی ہے۔

اور وہ غیر جسے خدا نے دنیا عطا فرمائی اور (مال دنیا کا) مالک کیا ہے، اور نعمت دنیا وی دی، اور اس پر اپنا فضل فرمایا، اس کے ساتھ یہ معاملہ اس لئے کیا ہے کہ اس کے ایمان کی جگہ ریتلی اور پتھریلی زمین ہے کہ اس میں پانی ٹھہرنا اور درخت اگنا اور کھیتی اور پھل کا پیدا ہونا دقّت سے خالی نہیں تو اس زمین پر کھاد وغیرہ ڈالی جاتی ہے جس سے پودوں اور درختوں کی پرورش ہو اور وہ کھاد دنیا اس کا سامان ہے تاکہ اس سے درخت ایمان اور نہالِ اعمال کی جو اس زمین میں اگے ہیں، حفاظت ہو، اگر یہ چیز اس سے علیحدہ کردی جائے، تو پودے اور درخت سوکھ جائیں گے، پھل جاتے رہیں گے، پس گھر ہی اجڑ جائے گا، حالانکہ خداوند تعالےٰ اس کے بنانے کا ارادہ رکھتا ہے، تو اے فقیر! دولت مند آدمی کا درختِ ایمان کمزور جڑ کا ہوتا ہے، اور اس قوت سے خالی جو تیرے درخت ایمان میں بھری ہوئی ہے، اس کی مضبوطی اور اس کا لگاؤ انہی چیزوں سے ہے، جو مال دنیا اور طرح طرح کی نعمتیں اس کے پاس تجھ کو نظر آتی ہیں، اگر درخت کی کمزوری میں یہ چیزیں اس سے الگ کردی جائیں تو ایمان کا درخت سوکھ کر کفر و انکار (پیدا)

ہو جائے گا، اور وہ شخص منافقین و مرتدین و کفار میں شامل ہو جائے گا، البتہ (اگر)
خداوند تعالیٰ دولتمند کی طرف صبر و رضا و یقین علم اور طرح طرح کی معرفتوں کے لشکر
بھیجے اور اس سے اس کا ایمان قوی ہو جائے تو پھر اس کو تونگری اور نعمتوں کے علیحدہ
ہو جانے کی پروا نہیں رہے گی۔[1]

دنیا کی صحیح حیثیت

حضرت شیخ کے یہاں رہبانیت کی تعلیم نہیں، وہ دنیا کے استعمال اور اس سے بقدر
ضرورت انتفاع سے منع نہیں فرماتے، اس کی پرستش اور غلامی اور اس سے قلبی تعلق اور
عشق سے منع فرماتے ہیں، ان کے مواعظ در حقیقت حدیث نبوی "إن الدنیا خلقت لکم وإنکم
خلقتم للآخرۃ" (بیشک دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی (یعنی تمہاری لونڈی ہے) اور تم آخرت
کے لئے پیدا کئے گئے) کی تفسیر ہیں۔ ایک موقع پر فرماتے ہیں:۔

"دنیا میں اپنا مقسوم اس طرح مت کھا کہ وہ بیٹھی ہوئی ہو اور تو کھڑا ہو، بلکہ اس کو
بادشاہ کے دروازہ پر اس طرح کھا کہ تو بیٹھا ہوا ہو، اور وہ طباق اپنے سر پر رکھے ہوئے کھڑی
ہو، دنیا خدمت کرتی ہے، اس کی جو حق تعالیٰ کے دروازہ پر کھڑا ہوتا ہے، اور جو دنیا کے
دروازہ پر کھڑا ہوا ہوتا ہے، اس کو ذلیل کرتی ہے، حق تعالیٰ کے ساتھ عزت و تونگری
کے قدم پر۔"[2]

ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے:۔

"دنیا ہاتھ میں رکھنی جائز، جیب میں رکھنی جائز، کسی اچھی نیت سے اس کو جمع رکھنا جائز

---

[1] رموز الغیب (۲۵) [2] فیوض یزدانی مجلس (۲۱)

باقی قلب میں رکھنا جائز نہیں (کہ دل سے بھی محبوب سمجھنے لگے) دروازہ پر اس کا کھڑا ہونا جائز باقی دروازہ سے آگے گھسنا نا جائز ہے نہ تیرے لئے عزت ہے۔"[1]

خلفاء اور حکام وقت پر تنقید

حضرت شیخ صرف مواعظ، پند و نصیحت اور ترغیب و تشویق ہی پر اکتفا نہیں فرماتے تھے، جہاں ضرورت سمجھتے تھے، بڑی صاف گوئی اور جرأت کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے، حکام و سلاطین اور خلیفۂ وقت پر بھی تنقید اور ان کے غلط افعال اور فیصلوں کی مذمت سے بھی باز نہیں رہتے تھے، اور اس بارہ میں کسی کی وجاہت اور اثر و نفوذ کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے، حافظ عماد الدین ابن کثیر اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں

کان یامر بالمعروف وینھی عن المنکر	آپ خلفاء، وزراء، سلاطین، قضاۃ،
للخلفاء والوزراء والسلاطین	خواص و عوام سب کو امر بالمعروف
والقضاۃ والخاصۃ والعامۃ	نہی عن المنکر فرماتے اور بڑی صفائی اور
یصدعھم بذلک علی رؤس	جرأت کے ساتھ ان کو بھرے مجمع میں اور
الأشھاد ورؤس المنابر وفی	بر سر منبر علی الاعلان ٹوک دیتے، جو کسی ظالم
المحافل وینکر علی من یولی الظلمۃ	کو حاکم بناتا اس پر اعتراض کرتے، اور
ولا تاخذہ فی اللہ لومۃ لائم[2]	خدا کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی
	آپ کو پرواہ نہ ہوتی۔

صاحب "قلائد الجواہر" لکھتے ہیں کہ جب خلیفہ مقتفی لامر اللہ نے قاضی ابو الوفا یحییٰ بن

---

[1] فیوض یزدانی مجلس (۵۱) [2] قلائد الجواہر ص۸

سعید بن یحییٰ بن المظفر کو قاضی بنایا جو ابن المرجم الظّالم کے لقب سے مشہور تھا تو حضرت نے برسر منبر خلیفہ کو مخاطب کرکے فرمایا:۔

ولّیت علی المسلمین أظلم الظالمین	تم نے مسلمانوں پر ایک ایسے شخص کو حاکم
ماجوابك غدا عند رب العالمین	بنایا ہے جو اظلم الظالمین ہے کل کو قیامت
أرحم الراحمین۔	کے دن تم اس رب العالمین کو جو ارحم
	الراحمین ہے کیا جواب دوگے؟

مورخ موصوف کا بیان ہے کہ خلیفہ یہ سن کر لرزہ براندام ہوگیا، اور اس پر گریہ طاری ہوگیا، اور اس نے اسی وقت قاضی کو اس عہدہ سے ہٹا دیا۔[۱]

حضرت شیخ ان "درباری سرکاری" علماء اور مشائخ کی بھی پر زور تردید اور پردہ دری فرماتے تھے، جنھوں نے سلاطین اور ناخدا ترس حکام کی مصاحبت اختیار کی تھی، اور ان کی ہاں میں ہاں ملانا ان کا شعار تھا، جن کی وجہ سے ان سلاطین و حکام کو زیادہ جرأت اور بے خوفی پیدا ہوگئی تھی، ایک موقع پر اسی طبقے کو خطاب کرکے فرماتے ہیں:۔

"اے علم و عمل میں خیانت کرنے والو! تم کو ان سے کیا نسبت، اے اللہ اور اس کے رسول کے دشمنو! اے بندگان خدا کے ڈاکوؤ! تم کھلے ظلم اور کھلے نفاق میں (مبتلا) ہو، یہ نفاق کب تک رہے گا؟ اے عالمو! اور اے زاہدو! شاہان و سلاطین کے لئے کب تک منافق بنے رہوگے کہ ان سے دنیا کا زر و مال اور اس کی شہوات و لذات لیتے رہو، تم اور اکثر بادشاہ اس زمانے میں اللہ تعالیٰ کے مال اور اس کے بندوں کے متعلق ظالم و خائن بنے ہوئے ہیں، بار الٰہا، منافقوں کی شوکت توڑ دے، اور ان کو ذلیل فرما یا ان کو توبہ کی توفیق دے،

---

[۱] قلائد الجواہر ص

اور ظالموں کا قلع قمع فرما اور زمین کو ان سے پاک کر دے، یا ان کی اصلاح فرما۔"[1]

ایک دوسرے موقع پر اسی طبقہ کے ایک فرد کو اپنا مخاطب بناتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"تجھے شرم نہیں آتی کہ تیری حرص نے تجھ کو ظالموں کی خدمتگاری اور حرام خوری پر آمادہ کر دیا، تو کب تک حرام کھاتا اور دنیا کے ان (ظالم) بادشاہوں کا خدمتگار بنا رہے گا جن کی خدمت میں لگا ہوا ہے، ان کی بادشاہت عنقریب مٹ جائے گی، اور تجھے حق تعالیٰ کی خدمت میں آنا پڑے گا جس کی ذات کو کبھی زوال نہیں۔"[2]

دین کے لئے دلسوزی اور فکرمندی

حضرت شیخ دینی اور اخلاقی انحطاط کو (جس کا سب سے بڑا مرکز خود بغداد تھا) دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے، اور عالم اسلام میں جو ایک عام دینی زوال رونما تھا اس کے آثار دیکھ کر ان کے سینے میں حمیت اسلامی اور غیرت دینی کا جوش اٹھتا تھا، وہ اپنے اس قلبی احساس اور درد کو بعض اوقات چھپا نہیں سکے، اور یہ دریا ان کے خطبات اور مواعظ میں امنڈ آیا ہے۔

ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

"جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دین کی دیواریں پے درپے گر رہی ہیں اور اس کی بنیاد بکھری جاتی ہے، اے باشندگان زمین آؤ اور جو گر گیا ہے اس کو مضبوط کر دیں اور جو ڈھے گیا ہے اس کو درست کر دیں، یہ چیز ایک سے پوری نہیں ہوتی سب ہی کو مل کر کام کرنا چاہیے اے سورج، اے چاند، اور اے دن تم سب آؤ۔"[3]

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:۔

---

[1] فیوض یزدانی مجلس (۵۱) [2] ایضاً۔ مجلس (۵۲) [3] ملفوظات ص۴۹۵ (فیوض یزدانی)

"اسلام رو رہا ہے' ان فاسقوں اور ان بدعتیوں، گمراہوں، مکر کے کپڑے پہننے والوں اور ایسی باتوں کا دعویٰ کرنے والوں کے (ظلم) سے جو ان میں موجود نہیں ہیں' اپنے سر کو تھامے ہوئے فریاد مچا رہا ہے' اپنے متقدمین اور نظر کے سامنے والوں پر غور کرو کہ امرونہی بھی کرتے تھے' اور کھاتے پیتے بھی تھے' (اور دفعتاً انتقال پا کر ایسے ہو گئے) گویا ہوئے ہی نہ تھے' تیرا دل کس قدر سخت ہے؟ کتا بھی شکار کرنے اور کھیتی اور مویشی کی نگہبانی اور مالک کی حفاظت کرنے میں اپنے مالک کی خیر خواہی کرتا ہے' اور اسے دیکھ کر خوشی کے مارے کھلاریاں کرتا ہے' حالانکہ وہ اس کو شام کے وقت صرف ایک دو نوالے یا ذرا سی مقدار کھانا دیا کرتا ہے' اور تو ہر وقت اللہ کی قسم قسم کی نعمتیں شکم سیر ہو کر کھاتا رہتا ہے' مگر ان نعمتوں کے دینے سے جو اسے مقصود ہے' نہ تو اس کو پورا کرتا ہے' اور نہ اس کا حق ادا کرتا ہے (بلکہ اس کے برعکس) اس کا حکم رد کرتا ہے' اور اس کی حدود شریعت کی حفاظت نہیں کرتا۔"[1]

بیعت و تربیت

اِن پُر تاثیر اور انقلاب آفریں مواعظ سے اگرچہ اہلِ بغداد کو عظیم الشان روحانی اور اخلاقی نفع پہونچا، اور ہزار ہا انسانوں کی زندگی میں اس سے تبدیلی پیدا ہوگئی' لیکن زندگی کے گہرے تغیرات، ہمہ گیر اصلاح اور مستقل تربیت کے لئے صاحب دعوت سے مستقل اور گہرے تعلق اور مسلسل اصلاح و تربیت کی ضرورت تھی، مجالس دعوت و ارشاد مدارس کی طرح منضبط اور مستقل تربیت گاہیں نہیں ہوتیں جہاں طالبین کی تسلسل اور انضباط کے ساتھ تعلیم و تربیت اور نگرانی کی جائے، ان مجالس کے شرکاء و سامعین آزاد ہوتے ہیں' کہ ایک

---

[1] ملفوظات ص۵۰ (فیوض یزدانی)۔

مرتبہ وعظ سن کر چلے جائیں پھر کبھی نہ آئیں، یا ہمیشہ آتے رہیں، لیکن اپنی حالت پر قائم رہیں، اور ان کی زندگی میں بدستور بڑے بڑے خلا اور دینی اور اخلاقی شگاف باقی رہیں۔

اسلامی آبادی کا پھیلاؤ اور زندگی کی ذمہ داریاں اور معاشی تفکرات اتنے بڑھ گئے تھے، کہ مدارس کے ذریعہ سے (جن کو بہت سی رسوم و قیود کا پابند ہونا پڑتا ہے) عمومی اصلاح و تربیت کا کام نہیں لیا جا سکتا تھا، اور کسی بڑے پیمانے پر کسی دینی و روحانی انقلاب کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی، پھر اس کی کیا صورت تھی کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اپنے ایمان کی تجدید کرے، دینی ذمہ داریوں اور پابندیوں کو شعور اور احساس ذمہ داری کے ساتھ دوبارہ قبول کرے، اس میں پھر ایمانی کیفیات اور دینی جذبات پیدا ہوں، اس کے افسردہ و مردہ دل میں پھر محبت کی گرمی پیدا ہو، اور اس کے مضمحل قویٰ میں پھر حرکت و نشاط پیدا ہو، اس کو کسی مخلص اور خداشناس پر اعتماد ہو، اور اس سے وہ اپنے امراض روحانی و نفسانی میں علاج اور دین میں صحیح روشنی اور رہنمائی حاصل کرے، ناظرین کو اس کا اندازہ ہو چکا ہے کہ خلافت جس کا یہ اصلی فرض تھا، (اس لئے کہ جس نبی کی نیابت و نسبت پر یہ خلافت قائم تھی، بقول سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ وہ ہدایت کے لئے مبعوث ہوا تھا جبایت (تحصیل وصول) کے لئے نہیں) نہ صرف اس فریضہ سے غافل اور کنارہ کش ہو چکی تھی، بلکہ اپنے اعمال و کردار کے لحاظ سے اس کام کے لئے مضر اور اس کے راستے میں مزاحم تھی، دوسری طرف وہ اس قدر بدگمان، توہم پرست اور شکی واقع ہوئی تھی کہ کسی نئی تنظیم اور نئی دعوت کو جس میں وہ قیادت اور سیاست کی آمیزش پاتی، برداشت نہیں کر سکتی تھی، اس کو وہ فوراً کچل دیتی۔

ایسی صورت میں مسلمانوں میں نئی دینی زندگی، نیا نظم و ضبط اور نئے سرے سے حرکت و عمل پیدا کرنے کے لئے اس کے علاوہ کیا شکل تھی کہ خدا کا کوئی مخلص بندہ آنحضرت صلے اللہ

علیہ وسلم کے طریقہ پر ایمان و عمل، اور اتباع شریعت کے لئے بیعت لے اور مسلمان اس کے ہاتھ پر اپنی سابقہ غفلت و جاہلیت کی زندگی سے توبہ اور ایمان کی تجدید کریں، اور پھر وہ نائب پیغمبر ان کی دینی نگرانی، اور تربیت کرے، اپنی کیمیا اثر صحبت، اپنے شعلۂ محبت، اپنی استقامت اور اپنے نفسِ گرم سے پھر ایمانی حرارت، گرمیٔ محبت، خلوص و للّٰہیت، جذبۂ اتباعِ سنت اور شوق آخرت پیدا کرے، ان کو اس نئے تعلق سے محسوس ہو کہ انھوں نے ایک نئی زندگی سے توبہ کی ہے، اور ایک نئی زندگی میں قدم رکھا ہے، اور کسی اللہ کے بندے کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہے، وہ بھی یہ سمجھ کر ان بیعت کرنے والوں کی اصلاح و تربیت اور ان کی دینی خدمت اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد کی ہے، اور اس محبت و اعتماد کا مجھ پر نیا حق قائم ہو گیا ہے، پھر اپنے تجربہ و اجتہاد اور کتاب و سنت کے اصول و تعلیمات کے مطابق ان میں صحیح روحانیت، تقویٰ اور ان کی زندگی میں ایمان و احتساب و اخلاص، اور ان کے اعمال و عبادات میں کیفیات اور روح پیدا کرنے کی کوشش کرے، یہی حقیقت ہے اس بیعت و تربیت کی جس سے دین کے مخلص داعیوں نے اپنے اپنے وقت میں احیاء و تجدید دین اور اصلاح مسلمین کا کام لیا ہے، اور لاکھوں بندگان خدا کو "حقیقت ایمان اور درجۂ احسان" تک پہونچا دیا ہے، اس سلسلۂ زریں کے سرِ حلقہ حضرت شیخ محی الدین عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جن کا نام اور کام اس "طب نبوی" کی تاریخ میں سب سے زیادہ روشن اور نمایاں ہے، الفاظ و اصطلاحات اور علمی بحثوں سے الگ ہو کر اگر واقعات و حقائق پر بنیاد رکھی جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اِس دورِ انتشار میں (جو ابھی تک قائم ہے) اصلاح و تربیت کا اس سے زیادہ سہل اور عمومی اور اس سے زیادہ موثر اور کارگر ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔

حضرت شیخ سے پہلے دین کے داعیوں اور مخلص خادموں نے اس راستہ سے کام کیا ہے

اور ان کی تاریخ محفوظ ہے، لیکن حضرت شیخ نے اپنی محبوب اور دلآویز شخصیت، خداداد روحانی کمالات، فطری علو استعداد اور ملکۂ اجتہاد سے اس طریقہ کو نئی زندگی بخشی، وہ نہ صرف اس سلسلہ کے ایک نامور امام اور ایک مشہور سلسلہ (قادریہ) کے بانی ہیں، بلکہ اس فن کی نئی تدوین و ترتیب کا سہرا آپ ہی کے سر ہے، آپ سے پہلے وہ اتنا مدون اور مرتب اور مکمل و منضبط نہ تھا، اور نہ اس میں اتنی عمومیت اور وسعت ہوئی تھی، جتنی آپ کی مقبولیت اور عظمت کی وجہ سے پیدا ہو گئی، آپ کی زندگی میں لاکھوں انسان اس طریقہ سے فائدہ اٹھا کر ایمان کی حلاوت سے آشنا اور اسلامی زندگی اور اخلاق سے آراستہ ہوئے، اور آپ کے بعد آپ کے مخلص خلفاء اور باعظمت اہل سلسلہ نے تمام ممالک اسلامیہ میں دعوت الی اللہ اور تجدید ایمان کا یہ سلسلہ جاری رکھا جن سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں بیان کر سکتا، یمن، حضرموت، اور ہندوستان میں، پھر حضرمی مشائخ و تجار کے ذریعہ جاوہ اور سماٹرا میں اور دوسری طرف افریقہ کے براعظم میں لاکھوں آدمیوں کی تکمیل ایمان اور لاکھوں غیر مسلموں کے قبول اسلام کا ذریعہ بنا۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ وجزاہ عن الاسلام خیر الجزاء۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، ایک عارف باللہ اور محقق

عموماً لوگ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کو ایک متکلم و مناظر و محدث اور فقیہ (جدلی) کی حیثیت سے جانتے ہیں، ان کے علمی کمالات اور ان کی مناظرانہ تصنیفات کا مطالعہ کرنے والے، اپنے ذہن میں ان کا جو تصور قائم کرتے ہیں، وہ ایک نہایت ذہین و ذکی، وسیع العلم، قوی الحجت اور ایک عالم ظاہر سے کچھ اور زیادہ نہیں ہوتا، ان کے شاگرد رشید حافظ ابن قیمؒ کو مستثنیٰ کر کے (جنھوں نے شیخ الاسلام ہروی کی کتاب "منازل السائرین" کی شرح "مدارج السالکین" میں اپنی اور اپنے محبوب استاذ کی زندگی کا باطنی پہلو محفوظ کر دیا ہے، اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ دونوں اعلا درجہ کے عارف باللہ اور صاحب ذوق و معرفت بزرگ تھے)، جن لوگوں نے عام سوانح نگاروں اور تذکرہ نویسوں کی مدد سے شیخ الاسلام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے یا ان کے متاخر تبعین و منتسبین کو دیکھ کر ان کے متعلق قیاس کیا ہے، وہ ان کو ایک محدث خشک اور ایک عالم ظاہر بین سے زیادہ مقام نہیں دے سکے، لیکن "مدارج السالکین" میں ابن قیم نے جستہ جستہ شیخ الاسلام کے جو اقوال و احوال پیش کیے ہیں، اور علامہ ذہبی وغیرہ نے ان کے تذکرہ میں برسبیل تذکرہ ان کے اخلاق و اذواق، عادات و شمائل اور اشغال و اعمال کا تذکرہ کیا ہے، اس کو سامنے رکھنے سے ایک منصف شخص اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ شیخ الاسلام کا شمار اس امت کے

عارفین اور اہل اللہ میں کیا جانا چاہیئے، اور اس کو اس بات کا وجدان حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ ان منازل پر فائز اور ان مقاصد سے بہرہ مند تھے، جن کے حصول کے لئے سالہا سال ریاضت، مجاہدہ، ائمہ فن سلوک کی صحبت اور دوام ذکر و مراقبہ کا راستہ بالعموم اختیار کیا جاتا ہے، اور جس کو متاخرین صوفیا "نسبت مع اللہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ "وذلك فضل الله يؤتيه من يشاء"

اہل نظر اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ذوق و معرفت، ایمان حقیقی اور یقین، اخلاص و استقامت، تزکیۂ باطن اور تہذیب اخلاق، کامل اتباع سنت، اور فنا فی الشریعت وہ حقیقی مقاصد ہیں، جن کے لئے مختلف وسائل اختیار کئے جاتے ہیں، محققین ان مقاصد کے حصول کو کسی ایک وسیلہ میں منحصر نہیں مانتے، بلکہ کہنے والوں نے یہاں تک کہدیا ہے، (اور کچھ غلط نہیں کہا) کہ "طرق الوصول الى الله بعدد أنفاس الخلائق" ابتدا میں ان مقاصد کے حصول کے لئے سب سے مؤثر اور طاقتور ذریعہ صحبت نبوی تھی، جس کی کیمیا اثری عالم آشکارا ہے، اس نعمت سے محرومی کے بعد اطبائے امت اور خلفائے نبوت نے اپنے اپنے زمانے میں مختلف بدل تجویز کئے، آخر میں مختلف اسباب کی بنا پر صحبت اور کثرت ذکر پر زور دیا گیا، جس کا منقح اور مدون طریقہ وہ نظام ہے، جو تصوف و سلوک کے نام سے مشہور ہو گیا ہے، لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں کہ ان مقاصد کا حصول ان وسائل پر منحصر نہیں، اجتبار و موہبت کے علاوہ ایمان و احتساب، محاسبۂ نفس، سنتوں کا تتبع، کتب حدیث و شمائل سے محبت و عظمت کے ساتھ اشتغال، کثرت نوافل و دعا، کثرت درود، نیت و احتساب کے ساتھ خدمت خلق، جہاد، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، دعوت و تبلیغ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی استحضار و اہتمام کے ساتھ تقرب کا ذریعہ اور حصول نسبت کا سبب بن سکتی ہے[1]،

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "صراط مستقیم" ملفوظات حضرت سید احمد شہیدؒ جمع کردہ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ و مولانا عبدالحی صاحبؒ بالخصوص حصہ سلوک راہ نبوت۔

وسائل مختلف ہو سکتے ہیں، لیکن مقصود ایک ہے، شیخ الاسلام کے حالات کے مجموعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ مقصود حاصل تھا، اور اسی کا اظہار یہاں مقصود ہے۔

کسی شخص کے متعلق اس کے بے تکلف حالات واذواق، اخلاق و عادات و کیفیات دیکھ کر اس بات کی شہادت دی جا سکتی ہے کہ وہ عارفین و محققین اور مقبولین و کاملین میں سے تھا، اس کا کوئی ظاہری مقیاس اور پیمانہ اور کوئی منطقی دلیل نہیں ہوتی، اہل اللہ اور عارفین کے حالات بکثرت پڑھنے اور ان کی صحبت میں رہنے سے ایک سلیم الفطرت اور صحیح الذوق انسان کو ایک ملکہ اور وجدان حاصل ہو جاتا ہے، جس سے وہ اس بات کا فیصلہ کر سکتا ہے، لیکن پھر بھی کچھ حالات اور علامات ایسی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شخص اپنی دینی سطح میں عوام سے بلند اور دین کی صحیح کیفیات واذواق اور اہل اللہ کے اخلاق سے بہرہ مند ہے، مثلاً ذوق عبودیت و انابت (توجہ الی اللہ کی ایک خاص کیفیت، عبادت کا ذوق و انہماک، ذوقِ دعا و ابتہال، زہد تجرید و تحقیر دنیا سخاوت و ایثار، فروتنی اور بے نفسی، سکینت و سرور، کمال اتباع سنت، صالحین میں مقبولیت، اور علماء وقت کی شہادت، متبعین و محبین کی دینداری اور حسن سیرت، وغیرہ وغیرہ ہم اس موقع پر انہی عنوانات کے ذیل میں شیخ الاسلام کے معاصرین اور مؤرخین کی شہادت اور ان کے تاثرات نقل کرتے ہیں۔

ذوق عبودیت و انابت

ذوق عبودیت و انابت الی اللہ کی حقیقی کیفیت اس بات کی بین شہادت ہے کہ اس شخص کا باطن یقین سے معمور اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی سے بھرپور، اپنی بے بسی، بے چارگی اور مالک الملک کے قدرت و جلال کے مشاہدے سے پر نور ہے، یہ یقین و مشاہدہ جب باطن میں

پیدا ہو جاتا ہے، تب الفاظ و اعمال سے ظاہر ہوتا ہے، اس سلسلہ میں حقیقت و تکلف میں زمین و آسمان کا فرق ہے، یہ فرق صاحبِ نظر اور صاحبِ وجدان سے چھپ نہیں سکتا۔

لیس التکحل فی العینین کالکحل

امام ابن تیمیہؒ کے واقعات بتلاتے ہیں کہ ان کو یقین و مشاہدہ حاصل تھا، اور اس نے ان کے اندر ایک افتقار و اضطرار اور ایک انابت و عبودیت کی کیفیت پیدا کر دی تھی، گذشتہ صفحات میں گذر چکا ہے کہ جب ان کو کسی مسئلہ میں اشکال یا کسی آیت کے سمجھنے میں دقت ہوتی تھی تو وہ کسی سنسان مسجد میں چلے جاتے تھے، اور پیشانی خاک پر رکھ کر دیر تک یہ کہتے رہتے تھے، "یا معلم ابراھیم فھمنی"[1] (اے ابراہیم کو علم عطا کرنے والے مجھے اس کی سمجھ عطا فرما) ذہبی کہتے ہیں

لم أر مثلہ فی ابتھالہ واستغاثتہ وکثرۃ توجھہ۔

میں نے گریہ و زاری اور اللہ سے استمداد اور فریاد اور توجہ الی اللہ میں ان کی نظیر نہیں دیکھی

وہ فرماتے ہیں:-

ان لیقف خاطری فی المسئلۃ أو الشئ أو الحالۃ التی تشکل علی فاستغفر اللہ تعالیٰ الف مرۃ أو أکثر أو أقل حتی ینشرح الصدر وینحلی اشکال ما أشکل۔

کسی وقت کسی مسئلہ میں میری طبیعت بند ہو جاتی ہے، یا کسی معاملے میں مجھے اشکال پیش آتا ہے تو میں ایک ہزار بار استغفار کرتا ہوں، یا اس سے کم یا زیادہ یہاں تک کہ طبیعت کھل جاتی ہے اور بدلی چھٹ جاتی ہے اور اشکال رفع ہو جاتا ہے

اس کیفیت میں جلوت، مجمع، بازار، شور و شغب کوئی چیز مانع نہ ہوتی، فرماتے ہیں۔

وأکون اذ ذاک فی السوق أو المسجد

ایسی حالت میں کبھی بازار میں، کبھی مسجد میں

---

[1] العقود الدریۃ ص۲۶

او الدرب او المدرسة لا یمنعنی	یا گلی یا مدرسہ میں ہوتا ہوں لیکن ذکر و استغفار
ذلك من الذكر والاستغفار الاأن	میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی، اور برابر مشغول
أنال مطلوبي۔[1]	رہتا ہوں یہاں تک کہ مطلوب حاصل ہو جاتا ہے

یہ یقین اور ذوق عبودیت جب پیدا ہو جاتا ہے، اور باطن میں سرائت کر جاتا ہے، تو انسان میں اپنی بے بسی اور بے چارگی، اپنی تہی دستی و بے بضاعتی کا ایسا احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ آستانۂ شاہی پر کشکول گدائی لے کر کھڑا ہو جاتا ہے، اور خدائی کا صدقہ اور رحمت کی بھیک مانگتا ہے، اس وقت اس کے روئیں روئیں سے یہ صدا آتی ہے کہ :۔

مفلسانیم آمدہ در کوئے تو	شیئاً للّٰہ از جمال روئے تو
دست بکشا جانب زنبیل ما	آفریں بر دست و بر بازوئے تو

ابن تیمیہؒ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ دولت فقر اور یہ عزت تذلل حاصل تھی، ابن قیمؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا اس بارہ میں ایسا حال دیکھا ہے جو کسی کے یہاں نظر نہیں آیا، وہ فرماتے تھے کہ نہ میرے پاس کچھ ہے، نہ میرے اندر کچھ ہے، وہ اکثر یہ شعر پڑھتے۔

انا المكدی انا المكدی	وهكذا كان ابی وجدی

(ترجمہ۔ ہاں میں تیرے در کا بھکاری ہوں! ہاں میں تیرے در کا بھکاری ہوں! اور کوئی نیا بھکاری نہیں، خاندانی بھکاری ہوں، اور پشتینی سائل، میرا باپ بھی تیرے در کا بھکاری تھا اور میرا دادا بھی۔)

ذوق عبادت و انہماک

عبادت کا ذوق اور اس میں انہماک اس وقت تک نہیں ہو سکتا، جب تک کہ انسان کو

---

[1] الکواکب الدریہ ص ۱۴۵

اس کی لذت اور اس کا حقیقی ذائقہ نہ نصیب ہو، اور وہ اس کے درد کی دوا، قلب کی غذا، اور روح کی قوت نہ بن جائے، اور اس کو مقام "جعلت قرة عيني في الصلاة" اور " أرحنا يا بلال" سے مناسبت نہ بخشی جائے، ابن تیمیہؒ کے معاصرین اور واقفین حال اس کی شہادت دیتے ہیں کہ ان کو اس دولت بیدار سے حصہ ملا تھا، اور ان کو خلوت و مناجات اور نوافل و عبادات کا خاص ذوق تھا، اور ان کا انہماک اس سلسلہ میں بہت بڑھا ہوا تھا، "الکواکب الدریہ" میں ہے۔

وكان في ليله منفرداً عن الناس	رات کو وہ تمام لوگوں سے علیحدہ رہتے تھے
كلهم خاليا بربه عزوجل ضارعاً إليه	اس وقت خدا کے سوا کوئی نہیں ہوتا تھا، وہ
مواظبا على تلاوة القرآن العظيم	تھے اور گریہ و زاری، برابر قرآن مجید پڑھتے
مكرراً لأنواع التعبدات الليلية	رہتے، رات، اور دن مختلف قسم کے نوافل و
والنهارية، وكان اذا دخل في الصلاة	عبادات میں مشغول رہتے، جب نماز شروع
ترتعد فرائصه وأعضاؤه حتى	کرتے تو ان کے شانے اور اعضا کانپنے لگتے
يميل يمنة ويسرة۔[1]	یہاں تک کہ ان کو دائیں بائیں لرزش ہوتی

ایسے اہل قلوب اور اہل ذوق کی طاقت، اور نشاط، ذکر و عبادات سے قائم ہوتا ہے، اگر اس میں فرق واقع ہو تو ان کی قوت جواب دے جاتی ہے اور ان کو محسوس ہوتا ہے کہ فاقہ ہوا، ابن قیم لکھتے ہیں۔

وكان اذا صلى الفجر يجلس في مكانه	نماز فجر کے بعد اپنی جگہ بیٹھے رہتے، یہاں تک کہ
حتى يتعالى النهار جداً يقول هذه	دن اچھی طرح چڑھ آتا، کوئی پوچھتا تو
غدوتي لو لم اتغد هذه الغدوة	فرماتے یہ میرا ناشتہ ہے، اگر میں یہ ناشتہ
سقطت قواي۔[2]	نہ کروں تو میری قوت میں سقوط ہو جائے

---

[1] الکواکب ص ۱۵۶ [2] الردالوافر ص ۳۶

اور میرے قوی کام نہ کریں۔

اس ذوقِ اہتمام کے بعد اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرما دیتا ہے، اور ذکر و عبادت معمولات طبیعت ثانیہ بن جاتے ہیں، ذہبی لکھتے ہیں کہ:۔

لہ أوراد وأذكار يه منها بكيفية وجمعية۔[1]	وہ اپنے اذکار و اوراد کی پوری پابندی کرتے تھے، اور ہر حالت میں جمعیت خاطر کے ساتھ ادا کرتے تھے۔

زہد و تجرید و تحقیر دنیا

زہد اور دنیا کی تحقیر کی سچی کیفیت اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ دنیا کی حقیقت پوری طرح منکشف اور "ان الدار الآخرة لهي الحيوان" اور "ما عند الله خير وأبقى" کا حال پوری طرح طاری نہ ہو جائے، اور یہ یقین و معرفت صحیحہ اور تعلق باللہ کے بغیر ممکن نہیں، ان کے معاصرین نے ان کے زہد و تجرید اور فقر اختیاری کا جا بجا تذکرہ کیا ہے، ان کے رفیق درس اور ہم عصر شیخ علیم الدین البرزالی (م ۷۳۸ھ) فرماتے ہیں:۔

وجرى على طريقة واحدة من اختيار الفقر والتقلل من الدنيا ورد ما يفتح به عليه۔[2]	شروع سے آخر تک ان کی حالت یکساں رہی کہ انھوں نے ہمیشہ فقر کو ترجیح دی، دنیا سے بقدر ضرورت اور برائے نام تعلق رکھا اور جو ملا اس کو واپس کر دیا۔

جب یہ کسی کا حال بن جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کو غنائے قلب کی دولت سرمدی سے نوازتا ہے، تو اس کو قیصر و کسریٰ کی سلطنت ہیچ معلوم ہونے لگتی ہے، اور وہ اس کی طرف نگاہ

---

[1] الرد الوافر ص۱۸ [2] ایضاً ص۶۵

اٹھا کر دیکھنا گناہ اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری سمجھتا ہے، اس وقت وہ بیخودی کے عالم میں کہتا ہے

من دلق خود با فسر شاہاں نمی دہم   من فقر خود بملک سلیماں نمی دہم

از رنج فقر در دلِ گنجے کہ یافتم   ایں رنج را براحت شاہاں نمی دہم

اس کے مقام سے بے خبر کبھی اس کے بارے میں بدگمانی کرتے ہیں کہ وہ سلطنت پر طمع کی نگاہ ڈالتا ہے، اور وہ ان کی بے خبری اور بد ذوقی پر ماتم کرتا ہے کہ اس دولت جاوید کے بعد بھی اس ملک فانی پر نگاہ کی جا سکتی ہے؟ ابن تیمیہؒ کا یہی حال تھا، الملک الناصر نے ایک مرتبہ ان سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ بہت سے لوگ آپ کے مطیع ہو گئے ہیں، اور آپ کے دل میں سلطنت پر قبضہ کرنے کا خیال ہے، شیخ نے بڑے اطمینان کے ساتھ بلند آواز سے جس کو تمام حاضرین نے سنا، جواب دیا۔

انا أفعل ذلك؟ واللہ إن ملكك وملك المغل لا يساوي عندي فلسا[1]   میں ایسا کروں گا؟ خدا کی قسم تمہاری اور تاتاریوں کی سلطنت مل کر بھی میری نگاہ میں ایک پیسے کے برابر نہیں۔

سخاوت اور ایثار

اہل اللہ اور اخلاق نبوی کی میراث میں حصہ پانے والوں کی خاص صفت ایثار و سخاوت ہے، ابن قیمؒ نے "زاد المعاد" میں "الم نشرح" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ شرح صدر کی دولت اور ایمان و یقین کا نتیجہ سخاوت و ایثار ہے، اس لئے جس کو اس دولت سے حصہ ملے گا، سخاوت و ایثار اس کا شعار ہوگا، شیخ الاسلام کے معاصرین و احباب ان کی سخاوت کے بے حد معترف اور ثنا خواں ہیں، "الکواکب الدریۃ" میں ہے کہ "وھو أحد الأجواد الأسخیاء الذین یضرب

---

[1] الکواکب الدریہ صفحہ ۱۶۶

بهم المثل[1]" (وہ ان معدودے چند اہل سخاوت میں سے ہیں، جن کی سخاوت ضرب المثل ہے)
الحافظ ابن فضل اللہ العمری جو ان کے معاصر ہیں، اس سخاوت کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

کانت تاتیه القناطیر المقنطرة من	ان کے پاس ڈھیروں سونا، چاندی، اعلیٰ
الذهب والفضة والخیل المسومة	اصیل گھوڑے، جانور، املاک و اموال آتے وہ
والأنعام والحرث فیهب ذلك بأجمعه	سب کا سب اٹھا کر دوسروں کو دے دیتے یا
ویضعه عند أهل الحاجة فی موضعه	اہل ضرورت کے پاس رکھوا دیتے، اور صرف
لا یاخذ منه شیئا الا لیهبه ولا یحفظه	دوسروں کو دینے کے لئے لیتے اور صرف عطا
إلا لیذهبه۔[2]	کرنے کے لئے اٹھا رکھتے۔

ان کی سخاوت یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ اگر دینے کے لئے کچھ نہ ہوتا تو کپڑا اتار کر دے دیتے

کان یتصدق حتی اذا الم یجد شیئا	وہ صدقہ کرتے تھے، جب کچھ پاس نہ ہوتا تو اپنا
نزع بعض ثیابه فیصل به الفقراء۔[3]	کوئی کپڑا ہی اٹھا کر دیدیتے اور اہل حاجت کی کاربرآری کرتے۔

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں:۔

وکان یتفضل من قوته الرغیف	کھانے سے ایک روٹی، دو روٹیاں بچا لیتے
والرغیفین فیوثر ذلك علی نفسه[4]	اور اپنے اوپر ایثار کر کے دوسروں کو دے دیتے

ایثار کا ایک نازک مقام یہ ہے کہ آدمی اپنے دشمنوں اور حریفوں کے ساتھ فراخدلی بلکہ عفو و احسان بلکہ اس سے آگے بڑھ کر دعا اور خیر خواہی کے ساتھ پیش آئے، یہ مقام انہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے، جو انانیت اور حظوظ نفس سے بہت آگے بڑھ چکے ہوں، اور ان پر

---

[1] الکواکب الدریہ ص ۱۴۶ [2] ایضاً ص ۱۵۷ [3] ایضاً [4] ایضاً

نعمائے الٰہی کی ایسی بارش ہو اور سکینت و سرور اس درجہ کا حاصل ہو کہ وہ ان سب مخالفتوں کو ان کے مقابلے میں ہیچ اور پرِکاہ سمجھتے ہوں، اور جن کے اندر اپنے دشمنوں اور مخالفین کے لئے بھی، خیر طلبی و رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہو اور پر گذر چکا ہے کہ ۷۰۹ھ میں جب وہ دوسری بار رہا ہوئے تو سلطان نے تنہائی میں ان سے ان قضاۃ کے قتل کے بارے میں فتویٰ لینا چاہا جنھوں نے جاشنگیر کی حمایت کی تھی، اور سلطان کی معزولی کا فتویٰ دیا تھا، اور یہ بھی کہا کہ انھوں نے آپ کے خلاف شورش برپا کی، اور آپ کو تکلیف پہنچائی، اس کے جواب میں ابن تیمیہؒ نے ان کی بڑی مدح و توصیف کی، اور پرزور الفاظ میں سلطان سے ان کی سفارش کی، اور اس کو ان کے قتل کے ارادہ سے باز رکھا، ان کے سب سے بڑے حریف و مدمقابل قاضی ابن مخلوف مالکی کا یہ مقولہ بھی گذر چکا ہے "ہم نے ابن تیمیہؒ جیسا عالی ظرف و فراخ حوصلہ نہیں دیکھا کہ ہم نے تو ان کے خلاف سلطنت کو آمادہ کیا لیکن ان کو جب قدرت حاصل ہوئی تو ہم کو صاف معاف کر دیا اور الٹے ہماری طرف سے وکالت و مدافعت کی۔"

ان کے تلمیذ رشید اور ہر وقت کے ساتھی، حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ وہ اپنے دشمنوں کے لئے دعائے خیر کرتے تھے، میں نے نہیں دیکھا کہ وہ ان میں سے کسی کے لئے بد دعا کرتے ہیں، میں ایک روز ان کے سب سے بڑے حریف اور ایک ایسے صاحب کی خبر وفات لے کر آیا جو عداوت اور ان کو ایذا پہونچانے میں سب سے آگے تھے، انھوں نے مجھے جھڑک دیا، اور منہ پھیر لیا، "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھی، پھر فوراً ان کے مکان پر گئے، ان کی تعزیت کی، اور فرمایا کہ مجھے ان کی جگہ پر سمجھنا، جس چیز کی تم کو ضرورت پڑے گی میں تمہاری اس میں مدد کروں گا، اسی طرح ان سے ایسی ملاطفت اور دلجوئی کی باتیں کیں، جن سے وہ نہایت مسرور ہوئے، اور ان کو بڑی دعائیں دیں، اور ان کو اس پر سخت استعجاب ہوا۔

عفو و احسان، اعداء و مخالفین کے ساتھ شفقت و مرحمت کا یہ مقام عالی ایثار سے

بہت بلند اور آگے کا مقام ہے، یہ وہ مقام ہے، جو صدیقین اور خواص اولیاء کو ملتا ہے، ابن تیمیہؒ اس مقام پر فائز تھے، اور گویا زبان حال سے وہ کہتے تھے، جو اسی مقام کے کسی صاحب حال شاعر نے فارسی میں کہا ہے ؎

هر که ما را یار نبود ایزد او را یار بود ۔۔۔ هر که ما را رنج داده، راحتش بسیار باد
هر که اندر راه ما خارے نهد از دشمنی ۔۔۔ هر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد

فروتنی و بے نفسی

فروتنی اور بے نفسی اہل اللہ کی خاص صفت اور وہ مرتبۂ کمال ہے، جو ہزار کرامتوں سے بلند اور ہزار فضیلتوں سے بالاتر ہے، یہ مقام اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب خودی مٹ جاتی ہے، اور نفس کا کامل تزکیہ ہو جاتا ہے، شیخ الاسلام کو اپنے کمالات علمی اور عروج دینی و دنیوی کے ساتھ یہ کمال بھی حاصل تھا، ان کے اقوال پتہ دیتے ہیں کہ وہ بے نفسی وللّٰہیت اور ہضم نفس اور انکار ذات کے درجۂ علیا پر پہونچے ہوئے تھے، ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ وہ اکثر کہتے تھے "مالی شیٔ ولا منی شیٔ ولا فی شیٔ" اگر کوئی ان کے منہ پر ان کی تعریف کرتا تو فرماتے:۔

والله انی الی الآن اجدد اسلامی کل وقت، وما اسلمت بعد اسلاما جیدا[1] ۔۔۔ خدا کی قسم میں ابھی تک اپنے اسلام کی تجدید کرتا رہتا ہوں، اور ابھی تک نہیں کہہ سکتا کہ کامل طور پر مسلمان ہوں۔

کبھی کوئی تعریف کرتا تو یوں بھی فرماتے "انا رجل ملة لا رجل دولة"[2] (میں امت کا ایک عام آدمی ہوں، سلطنت و حکومت کا آدمی نہیں)

---

[1] مدارج السالکین ج ۱ ص ۲۹۶ [2] الکواکب الدریہ ص ۱۶۴

بے نفسی و عبودیت کے اس درجہ پر پہونچ کر آدمی کی یہ حالت ہوجاتی ہے کہ وہ اپنا نہ کسی پر کوئی حق سمجھتا ہے نہ اس کا کوئی مطالبہ کرتا ہے، نہ اس کو کسی سے شکایت ہوتی ہے، نہ اپنے نفس کا انتقام لیتا ہے، اللہ تعالےٰ نے ان کو اس مقام پر پہونچا دیا تھا، ابن قیم فرماتے ہیں:۔

سمعت شیخ الاسلام ابن تیمیۃ قدس اللہ روحہ یقول العارف لایری لہ علی احد حقا ولایشھد لہ علی غیرہ فضلا ولذلک لایعاتب ولایطالب ولایضارب۔[1]	میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ قدس اللہ سرہٗ سے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ عارف اپنا کسی پر کوئی حق نہیں سمجھتا اور نہ یہ جانتا ہے کہ اس کو کسی پر کوئی فضیلت حاصل ہے اسی لئے نہ وہ کسی سے شکایت کرتا ہے، نہ مطالبہ کرتا ہے، نہ مارپیٹ کرتا ہے۔

ان کے حالات سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ وہ "حدیث دیگراں" میں اپنا ہی حال بیان کر رہے ہیں۔

سکینت و سرور

اس ایمان و یقین اور اللہ تعالےٰ کے ساتھ اس صحیح تعلق، اور مخلوق سے آزادی، اور قلب کی وارستگی اور بے تعلقی کے بعد انسان کو وہ سکینت و سرور حاصل ہوتا ہے کہ اس زندگی ہی میں اس کو جنت کا مزہ آنے لگتا ہے، شیخ الاسلام نے (جیسا کہ ابن قیم نے نقل کیا ہے) خود ایک بار فرمایا۔

---

[1] مدارج السالکین ج ۱ ص ۴۹٦

ان فی الدنیا جنۃ من لم یدخلها	دنیا میں مومن کے لئے ایک ایسی جنت ہے کہ
لم یدخل جنۃ الآخرۃ۔ [۱]	جو اس میں یہاں داخل نہیں ہوا آخرت
	کی جنت سے محروم رہے گا۔

اہل نظر جانتے ہیں کہ اللہ تعالٰی کبھی اپنے مخلص بندوں کو اس زندگی میں بھی "لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون" کی دولت عطا فرماتا ہے، اور وہ اس کا نمونہ (بقدر وسعتِ دنیا) یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں، شیخ الاسلام اور ان کے رفقاء کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ دولت حاصل تھی، خود بھی ایک بار جوش میں آکر فرمایا:۔

ما یصنع اعدائی بی إن جنتی	میرے دشمن میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں، میری
وبستانی فی صدری ان رحت	جنت اور میرا باغ میرے سینے میں ہے
فھی معی لا تفارقنی۔ [۲]	جہاں جاؤں گا، وہ میرے ساتھ ہے۔

یہ نسبت سکینت و رضا، زندگی میں اور بعد وفات ان کے ساتھ رہی، ابن قیم نے لکھا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ان کو خواب میں دیکھا، میں نے ان سے بعض اعمال قلبیہ کا ذکر کیا، اس پر شیخ نے فرمایا:۔

اما انا فطریقتی الفرح	بھائی میری نسبت تو فرحت و سرور
والسرور بہ۔ [۳]	کی ہے۔

ابن قیم لکھتے ہیں:۔

وھکذا کانت حالہ فی الحیاۃ	یہی حالت ان کی زندگی میں بھی تھی کہ ان کے
یبدو ذلک علی ظاھرہ وینادی	چہرے پر فرحت و سرور کے آثار نظر آتے

---

[۱] الرد الوافر ص۳۶ [۲] الوابل الصیب ص۶۶ [۳] اغاثۃ اللہفان

به علیه حالہ۔[1] تھے اور ان کی کیفیت اس کا اعلان کرتی تھی۔

کمالِ اتباعِ سنت

اس مقام (قبولیت وصدیقیت) کی ابتداء اتباع سنت سے ہے، اور اس کی انتہا بھی کمالِ اتباعِ سنت پر ہے، حدیث وسنت کے ساتھ ابن تیمیہ کا شغف و انہماک ان کے مخالفین کو بھی تسلیم ہے، لیکن یہ شغف وانہماک محض علمی ونظری نہ تھا، عملی اور ظاہری بھی تھا، ان کے معاصرین شہادت دیتے ہیں کہ مقام رسالت کا جیسا ادب واحترام اور اتباع سنت کا جیسا اہتمام ابن تیمیہ کے یہاں دیکھا، کسی اور کے یہاں نظر نہیں آیا، حافظ سراج الدین البزار قسم کھا کر کہتے ہیں:۔

لا واللہ ما رأیت أحدًا اشد	خدا کی قسم میں نے رسول اللہ صلے اللہ
تعظیما لرسول اللہ صلی اللہ علیہ	علیہ وسلم کا اتنا ادب واحترام کرنے والا
وسلم ولا أحرص علی اتباعہ	اور آپ کے اتباع اور آپ کے دین کی
ونصر ما جاء بہ منہ۔[2]	نصرت کی حرص رکھنے والا ابن تیمیہؒ سے
	بڑھ کر نہیں دیکھا۔

یہ چیز ان پر اتنی غالب اور ان کی زندگی میں نمایاں تھی، کہ دیکھنے والوں کا قلب شہادت دیتا تھا کہ اتباع کامل اور سنت کا عشق اسی کا نام ہے، علامہ عماد الدین الواسطی فرماتے ہیں:۔

---

[1] مدارج السالکین [2] الکواکب الدریہ ص ۱۴۹

ما رأينا في عصرنا هذا من تستجلی	ہم نے اپنے زمانے میں ابن تیمیہ ہی کو
النبوة المحمدية وسننها من	ایسا پایا کہ نبوت محمدی کا نور ان کی
اقواله وافعاله الا هذا الرجل	زندگی میں اور سنتوں کا اتباع ان کے
يشهد القلب الصحيح ان هذا	اقوال وافعال میں عیاں تھا، قلب سلیم
هو الاتباع حقيقة۔[1]	اس کی شہادت دیتا تھا کہ حقیقی اتباع
	اور کامل پیروی اسی کا نام ہے۔

صالحین میں مقبولیت اور علماء وقت کی شہادت

کسی انبوہ اور عوام کی بھیڑ کا کسی شخص کی تعریف کرنا مقبولیت عند اللہ و استقامت اور علو مرتبت کی دلیل نہیں، دلیل اس کے زمانے کے اہل صلاح و استقامت اور اہل علم اور اہل بصیرت کی شہادت اور توصیف ہے، نیز یہ کہ اس کے پیروؤں، اس سے محبت اور تعلق رکھنے والوں اور اس کے پاس اٹھنے بیٹھنے والوں میں صلاح و سداد، حسن اعتقاد، تقوی و احتیاط اور آخرت کی فکر اور اہتمام پایا جائے، اور وہ اپنے ابنائے زمانہ سے اپنی دینداری اور سلامت روی میں ممتاز ہوں، ابن تیمیہؒ کا معاملہ یہی تھا کہ اس زمانے کے ممتاز ترین اہل صلاح و رشد اور اصحاب علم و نظر، ان کی عظمت و فضیلت، صحت اعتقاد اور سلامت عقیدہ کے قائل و معترف اور ان کے مداح تھے، اور ان کے مخالفین میں بڑی تعداد حکومت کے متوسلین اور ابنائے دنیا کی تھی، جو جاہ طلبی کے مریض اور دولت و عزت کے خواہاں تھے،[2]

---

[1] جلاء العینین صـ ۳ [2] اس کلیہ سے وہ حضرات مستثنیٰ ہیں جن کو کوئی غلط فہمی تھی یا ان کا اختلاف خالص علمی و اصولی تھا، "وما من عام الا وقد خص منه البعض"۔

صاحبؒ "کواکب" لکھتے ہیں:۔

قالوا ومن امعن النظر ببصیرتہ	لوگ بیان کرتے ہیں کہ جو ذرا غور سے
لم یر عالما من اھل ای بلد شاء	کام لے گا، وہ دیکھے گا کہ ان کا جو موافق
موافقا لہ الاورآہ من أتبع علماء	جس شہر میں بھی ہے، وہ اس شہر کے
بلدہ للکتاب والسنۃ واشغلھم	علماء میں سب سے زیادہ کتاب وسنت کا
بطلب الآخرۃ والرغبۃ فیھا	متبع اور طلب آخرت میں مشغول اور
وابلغھم فی الاعراض عن الدنیا	سب سے زیادہ اس کا حریص اور دنیا سے
والاھمال لھا ولایری عالما	بے پرواہ اور اس کی طرف غیر متوجہ نظر
مخالفا لہ منحرفا عنہ الاوھو	آئے گا، اس کے برخلاف ان کا جو مخالف
من اکبرھم نھمۃ فی جمع الدنیا واکثرھم	نظر آئے گا وہ دنیا کا حریص، بوالہوس
ریاءً اوسمعۃ۔ واللہ اعلم۔[1]	ریاکار اور شہرت کا طالب دکھائی دے گا'
	واللہ اعلم۔

علامہ ذہبی کے یہ الفاظ بھی فراموش کرنے کے قابل نہیں:۔

وأخیف فی نصر السنۃ المحفوظۃ	سنت کی نصرت کے جرم میں ان کو بہت
حتی اعلی اللہ تعالیٰ منارہ وجمع	ڈرایا دھمکایا گیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ
قلوب اھل التقوی علی محبتہ	نے ان کو سرخرو اور معزز کیا، اور اہل
والدعاء لہ۔[2]	تقویٰ کے قلوب کو ان کی محبت اور
	دعا کے لئے مجتمع کر دیا۔

---

[1] الکواکب الدریۃ ص ۱۶۱ [2] جلاء العینین ص ٦

تاتاریوں میں اشاعتِ اسلام

تاتاریوں کا ایک سال کے عرصہ میں برق وباد کی طرح وسیع اسلامی دنیا پر چھا جانا، اور عالم اسلام کو بزور شمشیر فتح کر لینا اتنا عجیب واقعہ نہیں، اس لئے کہ ساتویں صدی کا عالم اسلام ان بیماریوں اور کمزوریوں کا شکار تھا، جو بالعموم تہذیب و تمدن کے انتہائی ترقی کے بعد قوموں میں پیدا ہو جایا کرتی ہیں، اور ان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں، اس کے بالمقابل تاتاری تازہ دم، جفاکش بدوی زندگی کے عادی اور خونخوار اور خون آشام تھے، لیکن عجیب واقعہ اور تاریخ کا معمہ یہ ہے کہ اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں یہ نیم وحشی قوم اپنے مفتوح اور بے دست وپا مسلمان کے دین کی حلقہ بگوش بن گئی، جو اپنی ہر قسم کی مادی وسیاسی طاقت کھو چکا تھا، اور جس کے پیروؤں کو تاتاری سخت ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، پروفیسر ٹی، ڈبلیو، آرنلڈ اپنی مشہور کتاب دعوتِ اسلام (PREACHING OF ISLAM) میں استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

" لیکن اسلام اپنی گذشتہ شان وشوکت کے خاکستر سے پھر اٹھا، اور واعظینِ اسلام نے انہی وحشی مغلوں کو جنھوں نے ...... مسلمانوں پر کوئی ظلم باقی نہ رکھا تھا، مسلمان کر لیا، یہ ایسا کام تھا جس میں مسلمانوں کو سخت مشکلیں پیش آئیں، کیونکہ دو مذہب

اس بات کی کوشش میں تھے کہ مغلوں اور تاتاریوں کو اپنا معتقد بنائیں، وہ حالت بھی عجیب و غریب اور دنیا کا بے مثل واقعہ ہوگی جس وقت بدھ مذہب اور عیسائی مذہب، اور اسلام اس جد و جہد میں ہوں گے کہ ان وحشی اور ظالم مغلوں کو جنھوں نے ان تین بڑے مذہبوں کے معتقدوں کو پامال کیا تھا، اپنا مطیع بنائیں؟[1]

اسلام کے لئے ایسے وقت میں بدھ مذہب اور عیسائی مذہب کا مقابلہ کرنا اور مغلوں کو ان دونوں مذہبوں سے بچا کر اپنا پیرو بنانا ایسا کام تھا، جس میں بظاہر کامیابی ناممکن معلوم ہوتی تھی، مغلوں کے طوفان ہلاکت خیز سے مسلمانوں کے برابر کسی نے نقصان نہ اٹھایا تھا، وہ مشہور و معروف شہر جو ایک زمانے میں اسلامی علوم و فنون کا مرکز تھے، اور جہاں ایشیا کے ارباب علم و فضل آباد تھے، اکثر جلا کر خاک کر دیئے گئے تھے، مسلمانوں کے عالم اور فقیہ یا تو قتل کر دیئے گئے یا ان کو غلام بنا یا گیا،[2] خانان مغل جو اسلام کے سوائے اور سب مذہبوں پر مہربان تھے، اسلام کے ساتھ مختلف درجہ کی نفرت اور عداوت رکھتے تھے، چنگیز خاں نے حکم دیا تھا کہ جو لوگ جانوروں کو شرع کے مطابق ذبح کریں، ان کو قتل کر دیا جائے، اسی حکم کو قوبلائی خان نے اپنے زمانہ میں از سر نو جاری کیا، اور اس کی پیروی کے لئے مخبر اور مخبروں کے لئے انعام مقرر کئے، اور اس طرح سات برس تک مسلمانوں کو سخت سے سخت آزار پہونچائے، مفلسوں نے اس موقع پر دولت جمع کر لی، اور غلاموں نے آزادی کے

---

[1] دعوت اسلام (مترجمہ مولوی عنایت اللہ) صفحہ ۲۴۰-۲۴۱

[2] مغلوں نے مسلمانوں پر ایسے ظلم کئے کہ چینی تماشے والے جب پردہ پر عکس کی تصویر دکھاتے ہیں، تو ایک تصویر میں سفید داڑھی کا ایک بڈھا آدمی آتا ہے، جس کی گردن گھوڑے کی دم سے بندھی ہوتی ہے، اور گھوڑا اس کو گھسیٹے گھسیٹے پھرتا ہے، یہ تصویر گویا ظاہر کرتی ہے کہ مغلوں کے سواروں نے مسلمانوں کو کیسے آزار پہونچائے۔

لئے آقاؤں پر ذبیحہ کا الزام لگایا۔[1] گیوک خاقان کے عہد میں (۱۲۴۶ء تا ۱۲۴۸ء) جس نے کل انتظام سلطنت دو عیسائی وزیروں کے سپرد کر رکھا تھا، مسلمانوں کو سخت اذیتیں پہونچیں۔[2] ارغون خان نے بھی، جو چوتھا ایلخان (۱۲۸۴ء تا ۱۲۹۱ء) ہوا، مسلمانوں پر ظلم کئے اور عدالت اور مال کے محکموں میں جس قدر آسامیاں ان کے پاس تھیں، وہ خالی کرا لیں اور ان کا دربار میں آنا بند کر دیا۔[3]

باوجود ان مشکلات کے مغلوں اور وحشی قوموں نے جو مغلوں کے بعد آئیں، انہی مسلمانوں کا مذہب قبول کر لیا جن کو انھوں نے اپنے پیروں میں روندا تھا۔[4]

یہ واقعہ جتنا عجیب اور عظیم الشان ہے، اتنا ہی یہ امر حیرت انگیز ہے کہ تاریخ میں اس کی تفصیلات اور جزئیات بہت کم ملتی ہیں، اور جن لوگوں کے ہاتھوں یہ کارنامہ انجام پایا ان کا تاریخ کے دفتر میں بہت کم سراغ ملتا ہے، جن مخلصین نے اس خون آشام تاتاری قوم کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا، ان میں بہت کم لوگوں کا نام دنیا کو معلوم ہے، مگر ان کا یہ کارنامہ کسی اسلامی کارنامے سے کم نہیں، اور ان کا احسان نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ پوری انسانیت پر قیامت تک رہے گا کہ انھوں نے دنیا کو وحشت و بربریت سے محفوظ کر کے ایک ایسی قوم کی تولیت میں دے دیا جو خدائے واحد کی پرستار اور رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم کے دین کی علمبردار تھی۔

ہم یہاں مثال کے طور پر صرف چغتائی بن چنگیز خاں کی شاخ میں اشاعت اسلام کے

---

[1] ہوورتھ ج ۱ ص ۱۱۲-۴۷۳ جس وقت یہ دیکھا گیا کہ اس حکم سے مسلمان تاجروں کا دربار میں آنا بند ہو گیا اور اس کی وجہ سے تجارت کو نقصان پہونچا، تو یہ حکم منسوخ کر دیا گیا۔ [2] ہوورتھ ج ۱ ص ۱۶۵

[3] دی گوین ج ۳ ص ۲۶۵ [4] دعوت اسلام ص ۲۴۵، ۲۴۶

واقعہ کا ذکر کرتے ہیں، پروفیسر آرنلڈ لکھتا ہے:۔

"بلاد متوسط میں جو چغتائی ابن چنگیز خاں اور اس کی اولاد کے حصے میں آئے تھے، دعوت اسلام کے حالات کا پتہ کم چلتا ہے، اس سلسلہ میں پہلا بادشاہ جس کو نور اسلام کی برکت ملی، وہ براق خاں تھا، جو چغتائی خاندان کا پرپوتا تھا، اور جس نے تخت نشین ہونے کے دو برس کے بعد مسلمان ہو کر سلطان غیاث الدین (۱۲۶۶ء تا ۱۲۷۰ء) اپنا نام رکھا[1]، لیکن یہاں شروع زمانہ میں اسلام کی ترقی زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکی، چونکہ براق خاں کے مرنے کے بعد جو مغل مسلمان ہوئے تھے، انھوں نے پھر اپنا قدیم مذہب اختیار کیا، اور چودھویں صدی عیسوی سے پہلے اس حالت کی اصلاح ہو سکی، البتہ طرمشرین خاں جس نے ۱۳۲۲ء سے ۱۳۳۰ء تک سلطنت کی جس وقت مسلمان ہوا، تو چغتائیہ مغلوں نے بالعموم اسلام اختیار کر لیا، اور جب ایک دفعہ انھوں نے اپنے بادشاہ کی طرح اسلام قبول کر لیا، تو وہ مضبوط دل سے اس مذہب پر قائم رہے، لیکن اس سال میں بھی اسلام کا اور مذہبوں پر غالب آنا، جو حریف مقابل تھے یقینی امر نہ تھا، کیونکہ طرمشرین کے جانشینوں نے مسلمانوں کے اوپر ظلم وستم کرنے شروع کر دیئے، جب تک کاشغر کا بادشاہ جس کی ریاست چغتائیہ سلطنت کی تقسیم وضعف سے خود مختار ہو گئی تھی، اسلام کی حمایت کو نہ اٹھا، اس وقت تک اسلام کی ترقی ممکن نہ ہوئی، سلطان کاشغر کے مسلمان ہونے کی نسبت جس کا نام تغلق تیمور خاں (۱۳۴۷ء تا ۱۳۶۳ء) تھا، لکھا ہے کہ بخارا سے ایک بزرگ شیخ جمال الدین کاشغر میں آئے، اور انھوں نے تغلق تیمور کو مسلمان کیا، شیخ جمال الدین اور ان کے ساتھی سفر میں تھے کہ نادانستہ تغلق کی شکاری

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۲۴۲

زمین پر سے ان کا گذر ہوا، بادشاہ نے اس قصور میں ان سب لوگوں کی مشکیں کسوا کر اپنے سامنے طلب کیا، اور نہایت غصہ کی حالت میں ان سے پوچھا کہ تم لوگ کیوں ہماری زمین پر بے اجازت داخل ہوئے، شیخ نے جواب دیا کہ ہم اس ملک میں اجنبی ہیں، اور ہم کو مطلق خبر نہ تھی کہ ہم ایسی زمین پر چل رہے ہیں، جس پر چلنے کی ممانعت ہے، بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایرانی ہیں، تو اس نے کہا کہ ایرانی سے تو کتا بہتر ہوتا ہے، شیخ نے کہا کہ سچ ہے، اگر دین حق ہمارے پاس نہ ہوتا تو فی الحقیقت ہم کتے سے بھی بد تر تھے، یہ جواب سن کر تغلق تیمور حیران رہ گیا، اور حکم دیا کہ جب ہم شکار سے واپس آئیں تو یہ ایرانی ہمارے سامنے حاضر کئے جائیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بادشاہ نے شیخ جمال الدین کو علیحدہ لے جا کر کہا کہ جو کچھ تم اس وقت کہتے تھے، اس کو اب سمجھاؤ، دین برحق سے تمہارا کیا مطلب ہے، یہ سن کر شیخ نے اسلام کے احکام اور ارکان کو ایسے جوش سے بیان کیا کہ تغلق تیمور کا دل جو پہلے پتھر تھا، اب موم کی طرح نرم ہو گیا، شیخ نے حالت کفر کا ایسا مہیب نقشہ کھینچا کہ بادشاہ کو اپنی غلطیوں سے اب تک بے بصیرت رہنے کا یقین ہو گیا، لیکن اس نے کہا کہ اگر اس وقت میں اپنا مسلمان ہونا ظاہر کروں گا تو پھر رعایا کو راہ راست پر نہ لا سکوں گا، اس لئے کچھ عرصہ کے لئے تم سکوت کرو، جب میں اپنے باپ کے تخت اور ملک کا مالک بنوں، تو اس وقت تم میرے پاس آنا، چغتائیہ سلطنت اب حصہ ہو کر چھوٹی چھوٹی عملداریوں میں [illegible] ہو گئی تھی، اور برسوں کے بعد تغلق تیمور اس قابل ہوا کہ ان سب عملداریوں کو شامل کر کے پھر قلمرو چغتائیہ کی مثل ایک سلطنت قائم کر دے، اس عرصہ میں شیخ جمال الدین اپنے وطن کو چلے گئے، اور یہاں سخت بیمار پڑے، جب موت کا

وقت قریب آیا تو اپنے بیٹے رشید الدین سے کہا کہ تغلق تیمور ایک دن بڑا بادشاہ ہوگا، تم اس وقت اس کے پاس جانا اور میرا اسلام پہنچا کر بے خوف و خطر بادشاہ کو یاد دلانا کہ اس نے مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا، چند سال کے بعد تیمور تغلق نے باپ کا تخت حاصل کر لیا تو ایک دن رشید الدین بادشاہ کے لشکر میں پہونچا کہ باپ کی وصیت کو پورا کرے، لیکن باوجود کوشش کے اس کو خان کے دربار میں حضوری نہ ہوئی، آخرکار اس نے مجبور ہو کر یہ تدبیر کی کہ ایک دن علی الصباح تغلق کے خیمہ کے قریب اذان کہنی شروع کی، تغلق کی جب نیند خراب ہوئی تو غصہ ہوا، اس نے رشید الدین کو اپنے سامنے بلوایا، رشید الدین آیا اور اپنے باپ کا پیغام تغلق کو سنایا، تغلق کو پہلے ہی سے اپنے وعدہ کا خیال تھا، وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوا، اس کے بعد اس نے اپنی رعایا میں اسلام کی اشاعت کی، اور اس کے زمانے میں ان تمام ملکوں کا مذہب اسلام ہوگیا، جو چغتائی ابن چنگیز خاں کے تسلط میں رہتے تھے۔[1]

بعض ترکی مؤرخین کی تاریخوں میں یہ روایت اس طرح منقول ہے کہ تغلق تیمور نے اپنے شکاری کتے کی طرف اشارہ کر کے کمال حقارت سے شیخ جمال الدین سے پوچھا کہ یہ بہتر ہے کہ تم بہتر ہو؟ شیخ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ اگر میں دنیا سے ایمان کے ساتھ چلا گیا تو میں بہتر ہوں ورنہ یہ کتا، تغلق تیمور کے دل میں یہ بات چبھ گئی، اور اس نے اس کی تفصیل دریافت کی، اور پوچھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں؟ شیخ نے ایمان کی حقیقت بیان کی، اس پر تغلق تیمور نے ان سے خواہش کی کہ اس کی تخت نشینی کے بعد اس کو اپنی زیارت سے مشرف کریں، اور پھر وہ

---

[1] دعوت اسلام از آرنلڈ ص ۲۵۶

واقعہ پیش آیا، جو اوپر مذکور ہوا، بہر حال اتنا محقق ہے کہ تغلق تیمور کے اسلام لانے اور بالواسطہ کاشغر اور سلطنت چغتائیہ میں اسلام کی اشاعت کا ظاہری سبب شیخ جمال الدین ہیں، جن کے دل سے نکلے ہوئے ایک فقرہ نے اور ان کی قوتِ ایمانی اور اخلاص و درد نے وہ کام کیا جو ہزاروں تقریریں اور لاکھوں شمشیریں نہیں کرسکتیں۔

دعوتِ عشق و مقامِ انسانیت

عشق و محبتِ الٰہی

ساتویں صدی میں علم کلام اور عقلیت کی جو سرد ہوا عالم اسلام میں مشرق سے مغرب تک چلی تھی، اس سے دل کی انگیٹھیاں سرد ہو گئی تھیں، اگر کہیں عشق کی چنگاریاں تھیں تو راکھ کے ڈھیر کے نیچے دبی ہوئی تھیں، ورنہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک افسردگی، بلکہ مردہ دلی چھائی ہوئی تھی، اور کہنے والا دیہ سے کہہ رہا تھا کہ :-

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے

اس سرد اور خواب آور فضا میں مولانا جلال الدین رومی نے عشق کی صدا بلند کی اور اس زور سے بلند کی کہ ایک بار عالم اسلام کے جسم میں بجلی سے کوند گئی۔

مولانا نے کھل کر عشق کی دعوت دی، اور محبت کی کرامت اور عشق کی کرشمہ سازیاں بیان کیں۔

از محبت تلخہا شیریں شود　　　وز محبت مسّہا زرّیں شود
از محبت دردہا صافی شود　　　وز محبت دردہا شافی شود

از محبت سجن گلشن می شود — بے محبت روضہ گلخن می شود
از محبت سنگ روغن می شود — بے محبت موم آہن می شود
از محبت سقم صحت می شود — وز محبت قہر رحمت می شود
از محبت مردہ زندہ می شود — وز محبت شاہ بندہ می شود[1]

وہ عشق کی طاقتور نعمت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

جسم خاک از عشق بر افلاک شد — کوہ در رقص آمد و چالاک شد
عشق جانِ طور آمد عاشقا — طور مست و خر موسیٰ صعقا[2]

وہ فرماتے ہیں، عشق نہایت غیور و خود دار ہے، وہ ہفت اقلیم کی سلطنت کو خاطر میں نہیں لاتا جس نے ایک بار اس کا مزہ چکھ لیا، اس نے پھر کسی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی[3]

وہ دو عالم سے بیگانہ اور دنیا کا سب سے بڑا مست و دیوانہ ہے۔

با دو عالم عشق را بیگانگی
اندرو ہفتاد و دو دیوانگی[4]

وہ شاہوں کا شاہ اور مطلوبوں کا مطلوب ہے، بادشاہوں کے تخت و تاج اس کے قدموں کے نیچے ہیں۔

سخت پنہاں است و پیدا حیرتش — جان سلطانانِ جاں در حسرتش
غیر ہفتاد و دو ملت کیش او — تخت شاہاں تخت بندے پیش او[5]

---

[1] مثنوی ص ۱۳۴ [2] ایضاً ص ۸ [3] اقبال (بال جبریل) [4] ایضاً ص ۲۴۷ [5] ایضاً ص ۲۴۷

اس فقر جسور اور عشق غیور کا جب وہ تذکرہ کرنے لگتے ہیں تو خود ان پر جوش و سرمستی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور وہ بے خود ہو کر کہنے لگتے ہیں ؎

ملک دنیا تن پرستاں را حلال

ما غلامِ ملک عشقِ بے زوال[۱]

وہ کہتے ہیں کہ عشق کی ہی وہ بیماری ہے، جس سے بیمار کبھی شفا نہیں چاہتا، بلکہ اس میں اضافہ اور ترقی ہی کی دعا کرتا ہے ؎

جملہ رنجوراں شفا جویند و ایں رنج افزوں جوید و درد و چنیں

خوشتر زیں سم ندیدم شربتے زیں مرض خوشتر نباشد صحتے[۲]

لیکن وہ ایسی بیماری ہے کہ پھر کوئی بیماری نہیں ہوتی ؎

آں کلامت می رہاند از کلام

واں سقامت می جہاند از سقام[۳]

بیماری بھی ایسی بیماری ہے کہ ہزار صحتیں اس پر قربان، اس کی کلفت ایسی کلفت ہے کہ ہزار راحتیں اس پر نثار ؎

پس مقام عشق جان صحت است

رنجہا یش حسرت ہر راحت است[۴]

یہ عشق پاکباز اگر گناہ ہے تو ایسا گناہ ہے کہ طاعتیں اس کے سامنے ہیچ ہیں، اس سے ایک گھڑی میں جو ترقی حاصل ہوتی ہے، وہ سالہا سال کی ریاضت سے میسر نہیں ؎

زیں گنہ بہتر نباشد طاعتے سالہا نسبت بدین دم ساعتے[۵]

۱؎ مثنوی ص۵۹۱ ۲؎ ایضاً ص۵۹۹ ۳؎ ایضاً ص۵۹۹ ۴؎ ایضاً ۵؎ ایضاً

راہ عشق میں جو خوں بہے وہ کسی پانی سے کم پاک نہیں، شہید عشق کو ہمارے غسل و وضو کی ضرورت نہیں ۔

خون شہیداں راز آب اولیٰ تراست
ایں خطا از صد صواب اولیٰ تراست [۱]

عاشق وہ جگر سوختہ و دل باختہ ہیں کہ ان پر عام انسانوں کے قوانین جاری نہیں کئے جا سکتے، جو گاؤں سراسر ویران ہو گیا ہو اس پر خراج کیسا؟ ۔

عاشقاں را ہر نفس سوزید نیست
بر دہ ویران خراج و عشر نیست [۲]

عشق آدم کی میراث اور زیرکی و چالاکی شیطان کا سرمایہ ہے ۔

داند آں کو نیک بخت و محرم است
زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است [۳]

زیرکی و چالاکی میں اپنے دست و بازو (عقل و خرد) پر اعتماد ہوتا ہے، عشق میں کسی کے دامن سے وابستگی ہوتی ہے، اور سپردگی، زیرکی و چالاکی، شناوری (پیراکی) کا فن ہے، "عشق" کشتیٔ نوح، زیرک و چالاک کو اس طوفان میں بچتے، اور ساحل تک پہونچتے اور صاحب عشق کو غرق ہوتے کب دیکھا گیا ہے؟ ۔

زیرکی سباحی آمد در بحار | کم رہد، غرق است او پایان کار
عشق چوں کشتی شود بہر خواص | کم بود آفت، بود اغلب خلاص [۴]

عقل کی ہوشمندی، عشق کی حیرانی پر قربان کر دینے کے قابل ہے، وہ ہوش مندی

---

[۱] مثنوی ص ۱۳۹ [۲] ایضاً [۳] ایضاً ص ۳۴۴ [۴] ایضاً

محض ظن و قیاس ہے، اور یہ حیرانی مشاہدہ و عرفان ؎

زیرکی بفروش و حیرانی بخر
زیرکی ظنیست حیرانی نظر[۱]

مولانا عشق کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ محبوب بننا تو ہر ایک کے بس میں نہیں لیکن عاشق بننا ممکن ہے، اگر خدا نے تم کو محبوب نہیں بنایا ہے، تو تم عاشق بن کر زندگی کا لطف حاصل کرو ؎

توکہ یوسف نیستی یعقوب باش | ہمچو او با گریہ و آشوب باش
توکہ شیریں نیستی فرہاد باش | چوں نۂ لیلیٰ تو مجنوں گرد فاش[۲]

وہ ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ عاشق بننے میں جو مزہ ہے اور ترقی ہے، وہ محبوب بننے میں کہاں؟ اگر محبوبانِ عالم کو اس دولت سرمد کا پتہ چل جائے، تو وہ محبوبوں کی صف سے نکل کر "عشاق" کی صف میں شامل ہو جائیں ؎

ترک کن معشوقی و کن عاشقی
اے گماں بردہ کہ خوب و فائقی[۳]

لیکن عشق کی یہ دولت بیدار کسی مردہ و ناپائیدار محبوب کے لائق نہیں، عشق خود زندہ ہے، اس کو ایک زندہ اور پائندہ محبوب چاہیئے ؎

عشق بر مردہ نباشد پائیدار
عشق را بر حیؔ جاں افزائے دار[۴]

اسی زندہ و پائندہ حیؔ و قیوم محبوب سے عشق جاوداں کی تشفی و استواری ہے،

---

[۱] مثنوی ص۲۴۴ [۲] ایضاً ص۴۹ [۳] ایضاً ص۲۶۶ [۴] ایضاً ص۲۶۸

اسی سے اس کی تازگی اور آبیاری ہے ۔

عشق زندہ در رواں و در بصر ہر دمے باشد ز غنچہ تازہ تر

عشق آں زندہ گزیں کو باقیست وز شراب جانفزایت ساقیست

عشق آں بگزیں کہ جملہ انبیاء یافتند از عشق او کار دکیا[1]

حسن کی اس بارگاہ عالی میں عشق کو اپنی نارسائی کا شکوہ نہیں ہونا چاہیئے کہ حسن ازل سدا سے عشق نواز اور دوست طلب ہے ۔

تو مگو ما را بداں شہ بار نیست

با کریماں کارہا دشوار نیست[2]

یہ عشق دیکھنے میں ایک بیماری ہے جو دل کی شکستگی سے پیدا ہوتی ہے، یہ بیماری بڑی جان لیوا ہے لیکن آدمی اگر اس کو برداشت کر لے جائے تو اس کا نتیجہ معرفت حقیقی اور حیات ابدی ہے ۔

عاشقی پیداست از زاری دل نیست بیماری چوں بیماری دل

علت عاشق ز علتہا جداست عشق اصطرلاب اسرار خداست[3]

یہ بیماری سب بیماریوں کی دوا اور ہر قسم کے نفسانی و اخلاقی امراض کے لئے شفا ہے، جن روحانی امراض کے علاج سے طبیب مایوس اور معالج و مصلح دست بردار ہو چکے ہوں، اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہوتی ہو عشق ایک نگاہ میں اس کو اچھا کر سکتا ہے، برسوں کا مریض جب عشق کے ہاتھوں اپنے روحانی امراض کہنہ سے شفا پاتا ہے تو سرور و بے خودی کے عالم میں پکار اٹھتا ہے ۔

---

[1] مثنوی ص۱ [2] ایضاً [3] ایضاً ص۳

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما — اے طبیب جملہ علتہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما — اے تو افلاطون و جالینوس ما[۱]

عشق ایک شعلہ ہے جو خس و خاشاک کو جلا کر خاک کر دیتا ہے، اور محبوب کے سوا کسی کا روادار نہیں، وہ بڑا موحد، بڑا غیور ہے ؎

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت — ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

تیغ لا در قتلِ غیرِ حق براند — در نگر زاں پس کہ بعد از لا چہ ماند

ماند الا اللہ باقی جملہ رفت — شاد باش اے عشق شرکت سوز رفت[۲]

یہ عشق الٰہی ایک بحر ناپیدا کنار ہے، اس کی داستان ختم ہونے والی نہیں، زمانہ کی وسعت بھی اس کے لئے تنگ اور دنیا کی عمر بھی اس کی داستان سرائی کے لئے کوتاہ ہے، یہ اس حسن ازلی کا قصہ ہے جس کا نہ اول ہے، نہ آخر اس لئے یہاں خاموشی ہی بہتر اور اعتراف عجز ہی مناسب ہے ؎

شرح عشق از من بگویم بر دوام — صد قیامت بگزرد واں ناتمام

زانکہ تاریخ قیامت را حد است — حد کجا آنجا کہ وصف ایزد است[۳]

جہانِ دل

لیکن یہ عشق جس کی دعوت مولانا اس جوش و خروش سے دیتے ہیں، دل کی زندگی اور بیداری اور دل کی گرمی کے بغیر ممکن نہیں، ہر زمانہ کی طرح مولانا کے زمانے میں بھی دل کی طاقتوں اور وسعتوں سے غفلت اور ناواقفیت بڑھتی جا رہی تھی، اور دماغ

[۱] مثنوی ص ۵ [۲] ایضاً ص ۸۰۵ [۳] ایضاً ص ۴۴۲

کی عظمت کا سکہ دلوں پر بیٹھتا جا رہا تھا، دماغ روشن اور دل سرد ہوتے جا رہے تھے، مولانا نے زندگی میں مرکزی مقام حاصل کرتا جا رہا تھا، مولانا نے دل کی عظمت و وسعت کی طرف متوجہ کیا، اور اس کے عجائبات و فتوحات بیان کیے، اور یاد دلایا کہ انسان اپنے اس جسم خاکی میں کیسا سدا بہار باغ رکھتا ہے، اور اس کے پہلو میں کیسی دنیا آباد ہے، جس میں ملک کے ملک گم ہو جائیں، جس کو کسی دشمن کا خطرہ اور کسی رہزن کا اندیشہ نہیں ؎

امین آباد است دل اے مرداں | حصن محکم موضع امن واماں
گلشن خرم بکام دوستاں | چشمہا و گلستاں در گلستاں[1]

انھوں نے بتلایا کہ دنیا کے باغات چند دنوں کے مہمان، لیکن نخل دل سدا جواں اور باغ دل بہار بے خزاں ہے، جسم کا باغ برسوں میں لگتا ہے، اور دم میں اجڑ جاتا ہے، دلوں کے باغ لگنے میں دیر نہیں لگتی، مگر اس کی رعنائی اور تازگی میں کبھی فرق نہیں آتا ؎

گلشنے کز نقل روید یک دم است | گلشنے کز عقل روید خرم است
گلشنے کز تن دمد گردد تباہ | گلشنے کز دل دمد وافرحتاہ[2]

وہ تلقین کرتے ہیں کہ جسم کو جواں بنانے کی سعی لاحاصل اور سکندر کی طرح "چشمہ حیواں" کی ناکام تلاش کے بجائے عشق کے آب حیات کا ایک جرعہ نوش جان اور دل کی زندگی کا سامان کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ صحیح معنی میں زندہ دلی اور نشاط روح حاصل ہو اور ہر دور زندگی میں توانائی و رعنائی محسوس ہو۔

دل بخر تا دائما باشی جواں | از تجلی چہرہ ات چوں ارغواں
طالب دل شو کہ تا باشی چو گل | تا شوی شاداں و خنداں ہمچو گل[3]

۱؎ مثنوی ص ۱۹۹ ۲؎ ایضاً ص ۵۹۶ ۳؎ ایضاً ص ۱۵۴

لیکن دل کے لفظ سے دھوکہ نہ ہو، دل وہ نہیں ہے جو سینہ میں دھڑکتا ہے اور خواہشات نفس اور بوالہوسی کی آماجگاہ ہے، جو محبت کی لذت سے ناآشنا، یقین کی دولت سے محروم، ذوق وشوق سے خالی ہے جس کی کلی کبھی کھلتی نہیں، اور جس کی قسمت کبھی چمکتی نہیں، یہ دل دل نہیں، پتھر کی ایک سل ہے ؎

تنگ وتاریک است چوں جان جہود ۔۔۔ بینوا از ذوقِ سلطان ودود
نے دراں دل تاب نورِ آفتاب ۔۔۔ نے کشادِ عرصہ نے فتح بابؔ[۱]

یہ دل اپنی ساخت، اور اپنی صورت شکل، جسامت کے لحاظ سے ویسا ہی ایک دل ہے جیسے اہل دل کا بیدار و بے تاب دل، لیکن حقیقت کے لحاظ سے دیکھئے تو سوائے لفظی اشتراک اور جسمانی مشابہت کے دونوں میں کوئی مناسبت نہیں، وہ بھی پانی ہے، جو چشمۂ صافی میں رواں ہے، اور وہ بھی پانی ہے، جو کسی دلدل یا کیچڑ کے اندر ہے، لیکن پہلا پانی خالص پانی ہے، جس سے پیاس بھی بجھائی جا سکتی ہے، اور ہاتھ بھی صاف ہو سکتے ہیں، دوسرے پانی میں مٹی کا اتنا جزو ہے کہ اس سے پانی کا کام لینا مشکل ہے، یہی فرق دل اور دل میں ہے، ایک دل مادہ پرست اور بوالہوس، ایک بے حس اور مردہ دل انسان کا ہے، ایک دل انبیاء و اولیاء کا ہے، جس کی بلندی کے سامنے آسمان بھی پست اور جس کی وسعت کے آگے سارے عالم کی وسعت گرد ہے، اس لئے سوچ سمجھ کر کہو کہ ہمارے پہلو میں بھی دل ہے۔

تو ہمی گوئی مرا دل نیز ہست ۔۔۔ دل فراز عرش باشد نہ بہ پست
در گل تیرہ یقین ہم آب ہست ۔۔۔ لیک ازاں آبت نباید آبدست
زانکہ گر آب است مغلوب گل است ۔۔۔ پس دل خود را مگو کایں ہم دل است

---

[۱] مثنوی ص۱

آں دلے کز آسمانہا برتر است — آں دل ابدال یا پیغمبر است[1]

لیکن پھر تسلی دیتے ہیں کہ دل بہر حال دل ہے، اور خدا کے یہاں کوئی دل مردود نہیں ہے، وہ ہر دل کا خریدار ہے، اس لئے کہ خریداری سے اس کو کوئی فائدہ مقصود نہیں ؎

کالۂ کہ ہیچ خلقش ننگرید — از خلافت آں کریم آں را خرید
ہیچ قلبے پیش او مردود نیست — زانکہ قصدش از خریدن سود نیست[2]

پھر وہ فرماتے ہیں کہ معدہ کے قفس زریں کو چھوڑ کر دل کی آزاد بستی کی سیر کرو اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھو، تمہارے اور خالق کے درمیان بڑا حجاب یہی معدہ اور شکم پرستی ہے، تم اس حجاب سے نکلے کہ تم کو اس بارگاہ عالی سے سلام پہونچے ؎

معدہ را بگزار سوئے دل خرام
تا کہ بے پردہ ز حق آید سلام[3]

مقام انسانیت

مستبد شخصی سلطنتوں کے اثرات اور پیہم مظالم، مسلسل جنگوں کے نتیجہ میں عام انسانوں میں زندگی سے بیزاری، اپنے مستقبل سے مایوسی اور احساس کہتری پیدا ہو گیا تھا، اور انسان خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہو گیا تھا، عجمی تصوف نے فنائیت، انکار ذات اور خودشکنی کی تلقین اتنے جوش اور قوت سے کی تھی کہ خودنگری اور خودشناسی جس پر حرکت، جدوجہد اور کشمکش موقوف ہے ایک اخلاقی جرم اور مانع ترقی سمجھی جانے لگی تھی، انسانوں کے سامنے ملکوتی صفات کے حصول، اور لوازم بشریت سے انسلاخ، تجرد و تفرید کی تبلیغ اس انداز میں

---

[1] مثنوی ص۲۳۹ [2] ایضاً ص۵۲۱ [3] ایضاً ص۴۵۰

ہوئی تھی کہ انسان کو اپنی انسانیت سے شرم آنے لگی تھی، اور وہ اپنی ترقی انسانیت میں نہیں بلکہ ترک انسانیت میں سمجھنے لگا تھا، عام طور پر مقام انسانیت سے غفلت اور انسان کی رفعت و شرافت سے ذہول پیدا ہو گیا تھا، اور اس وقت کی ادبیات اور شعر و شاعری میں تحقیر انسانیت کی روح سرائت کر گئی تھی، اس کا نفسیاتی اثر یہ تھا کہ لوگوں میں عام طور پر اپنے بارے میں بے اعتمادی، ناامیدی، افسردگی، اور شکستہ دلی پائی جاتی تھی، اور انسان کبھی کبھی حیوانات اور جمادات پر رشک کرنے لگا تھا، وہ جوہر انسانیت سے ناواقف اور اپنی عظمتوں اور ترقیات سے غافل تھا، مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں اس پہلو کو ابھارا، اور انسان کی بلندی کا ترانہ اس جوش سے بلند کیا کہ اس کی سوئی ہوئی خودی بیدار ہو گئی، اور وہ اپنے مقام سے آگاہ ہو گیا، مولانا کی اس رجز خوانی کا پوری اسلامی ادبیات پر اثر پڑا، اور اس نے شعر و شاعری اور تصوف میں ایک نیا رجحان پیدا کر دیا۔

مولانا انسان کو اپنی انسانی خلقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جا بجا "احسن تقویم" کے خطاب سے یاد فرمایا ہے، یہ لباس موزوں خاص طور پر اسی کے لئے قطع کیا گیا ہے، اور اس کے قامت پر راست آتا ہے ؎

احسن التقویم در والتین بخواں — کہ گرامی گوہر است اے دوست جاں[1]

احسن التقویم از فکرت بروں — احسن التقویم از عرشش فزوں[1]

وہ فرماتے ہیں کہ انسان کے سوا اور کس پر "کرامت" کا تاج رکھا گیا ہے، اور "کرّمنا" اور "اعطیناک" کے خطاب سے مشرف کیا گیا ہے؟!

ہیچ کرّمنا شنید ایں آسماں — کہ شنید ایں آدمی پر غماں[2]

---

[1] مثنوی ص ۵۱۵ [2] ایضاً ص ۴۹۵

تاج کرمناست بر فرقِ سرت ‏ ‏ طوق اعطیناک آویز برت[1]

وہ فرماتے ہیں کہ انسان خلاصۂ کائنات اور مجموعۂ اوصاف عالم ہے انسان کیا ہے؟ ایک کوزہ میں دریا بند ہے اور ایک مختصر سے وجود میں پورا عالم پنہاں ہے ؎

آفتابے در یکے ذرہ نہاں ‏ ‏ ناگہاں آں ذرہ بکشاید دہاں

ذرہ ذرہ گردد افلاک و زمین ‏ ‏ پیش آں خورشید چوں جست از کمیں[2]

بحر علمے در نمی پنہاں شدہ ‏ ‏ در سہ گز تن عالمے پنہاں شدہ[3]

انسان آفرینش عالم کا مقصود اور تمام کائنات کا محسود ہے اسی سے اس عالم کا رنگ و بو اور زندگی کی آبرو ہے اس کی طاعت تمام موجودات پر فرض ہے ؎

ہر شرابے بندۂ آں قد و خد ‏ ‏ جملہ مستاں را بود بر تو حسد

ہیچ محتاجِ مئے گلگوں نئے ‏ ‏ ترک کن گلگونہ تو گلگونئے

جوہر است انسان و چرخ او را عرض ‏ ‏ جملہ فرع و سایہ اند و تو غرض

علم جوئی از کتب ہائے فسوس ‏ ‏ ذوق جوئی تو ز حلوائے سبوس

خدمتت بر جملہ ہستی مفترض ‏ ‏ جوہرے چوں عجز دارد با عرض[4]

یہی نہیں بلکہ انسان مظہر صفات الٰہی ہے، وہی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں تجلیات و آیات کا عکس نظر آتا ہے ؎

آدم اصطرلاب اوصاف علوست ‏ ‏ وصف آدم مظہر آیات اوست

ہرچہ در وے می نماید عکس اوست ‏ ‏ ہمچو عکس ماہ اندر آبِ جوست

خلق را چوں آب دان صاف و زلال ‏ ‏ وندرو تاباں صفات ذوالجلال

---

[1] مثنوی ص ۲۷۵ [2] ایضاً ص ۵۹۲ [3] ایضاً ص ۲۷۵ [4] ایضاً ص ۲۷۵

علم شان و عدل شان و لطف شان چوں ستارہ چرخ در آب رواں[۱]

اس سب کے فرمانے کے بعد وہ محسوس کرتے ہیں کہ انسان کی تعریف اور اس کی قدر و قیمت کا بیان اب بھی مکمل نہیں اور سچ پوچھئے تو کسی میں اس کے سننے کی تاب بھی نہیں۔

گر بگویم قیمت آں ممتنع
من بسوزم، ہم بسوزد مستمع[۲]

اس رفعت و بلندی کے بعد خدا کے سوا انسان کا کون خریدار ہو سکتا ہے، اور کون اس کی قیمت لگا سکتا ہے، حیف ہے کہ انسان خود اپنی قیمت نہ جانے، اور ہر قیمت پر ہر ایک کے ہاتھ بک جانے کے لئے تیار ہو، وہ بڑی دلسوزی سے فرماتے ہیں ؎

اے غلامت عقل و تدبیرات و ہوش
تو چرائی خویش را ارزاں فروش[۳]

پھر فرماتے ہیں کہ انسان کا سودا ہو چکا ہے، اللہ اس کا خریدار ہے، اور وہی انسان کا سچا قدر دان ہے ؎

مشتری ما است اللہ اشتریٰ از غم ہر مشتری ہیں بر تر آ
مشتری جو کہ جویاں تو است عالم آغاز و پایان تو است[۴]

لیکن یہ سب ان انسانوں کا تذکرہ ہے جو جوہر انسانیت سے آراستہ اور حقیقتِ انسانیت سے آشنا ہیں، ان انسان نما آدمیوں کا ذکر نہیں، جو انسانیت کا خول اور صورت ہی صورت ہیں، جو اپنے نفس کے مارے ہوئے، اور خواہشات نفس کے قتیل ہیں، یہ آدمی نہیں ہیں، آدمی کی بے جان تصویریں ہیں ؎

---

[۱] مثنوی ص۵۶۳ [۲] ایضاً ص۵۱۵ [۳] ایضاً ص۴۷۵ [۴] ایضاً ص۴۲۶

این نه مردانند اینہا صورت اند
مردۂ نان اند و کشتۂ شہوت اند[۱]

ہر زمانے کی طرح مولانا کے زمانے میں بھی یہ حقیقی انسان کمیاب اور عنقا صفت تھا، عام طور سے وہی انسان ملتے تھے، جو چوپایوں اور درندوں کے اخلاق رکھتے تھے، مولانا ان بہائم صفت اور درندہ خصلت انسانوں سے اکتا گئے تھے، اور ان کو انسان کی تلاش تھی، اپنی تلاش کا واقعہ ایک دلچسپ مکالمہ کی شکل میں بیان فرماتے ہیں۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر | کز دام و دد ملولم و انسانم آرزو است
زیں ہمرہان سست عناصر دلم گرفت | شیر خدا و رستم دستانم آرزو است
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما | گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزو ست[۲]

مقام انسانیت حضرت مخدوم بہاری کے مکتوبات میں

مقام انسانیت کے موضوع پر نظم میں حکیم سنائی، خواجہ فریدالدین عطار اور مولانا روم نے بہت کچھ فرمایا ہے، لیکن نثر میں حضرت مخدوم الملک بہاری کے مکتوبات سے زیادہ طاقتور، بلیغ اور مؤثر تحریر نظر سے نہیں گذری، ان کو پڑھ کر انسان کے دل میں اعتماد و حوصلہ، جرأت و ہمت، امید و رجا، ترقی و پرواز اور ان انتہائی کمالات تک پہونچنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے، جو انسان کے لئے مقدر ہیں، اور اس یاس و ناامیدی، کم حوصلگی و بے اعتمادی، افسردگی و شرمندگی کا ازالہ ہوتا ہے، جو "خود شکنی" و "خود انکاری" کے بعض کوتاہ اندیش مبلغوں نے پیدا کر دی تھی، اور جس کے نتیجے میں انسانیت ننگ و عار اور

---

[۱] مثنوی ص ۹۵۹ [۲] دیوان

ایک ناقابلِ اصلاح فطری عیب اور ناقابلِ تلافی تقصیر بن گئی تھی، اور در و دیوار سے یہ صدا آنے لگی تھی۔ ؎

وجودک ذنبٌ لایقاس بہ ذنبٌ [1]

اور یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ انسان کی ترقی میں خود انسانیت سب سے بڑھ کر سدِّ راہ اور ایک سنگِ گراں ہے، جس کو راستہ سے ہٹانا انسان کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے، انسان اپنے کو محسود و مسجودِ ملائکہ سمجھنے کے بجائے فرشتوں پر رشک کرنے لگا تھا، اور اس ناسوتی فطرت اور خصائص انسانیت سے منحرف اور باغی ہو کر اپنے اندر ملکوتی صفات پیدا کرنے اور فرشتوں کی تقلید کرنے کا خواہشمند نظر آتا تھا۔

اس فضا میں حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے ایک نامانوس آواز بلند کی اور اس جوش اور بلاغت کے ساتھ انسانیت کی بلندی اور انسان کی رفعت و محبوبیت اور اس کے خلیفۃ اللہ ہونے کا اعلان کیا، اور اس مضمون کو اپنے مکتوبات میں اتنے بار دہرایا اور مختلف اسالیب اور طریقوں سے اس کو بیان کیا کہ اگر اس کو یکجا جمع کر دیا جائے تو اس موضوع پر ایک ایسا ادبی ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے، جس کو پڑھ کر انسان کا دل حوصلوں اور امنگوں سے معمور ہو جاتا ہے، اور انسان کے قلبِ افسردہ اور تنِ مردہ میں زندگی کی روح دوڑ جاتی ہے، اور اس کو اپنی انسانیت پر ناز ہونے لگتا ہے۔

خالق کی نظرِ خاص

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ موجودات و مصنوعات تو بہت تھے، اور ایک سے

---

[1] اے انسان تیرا وجود ہی ایک ایسا گناہ ہے، جس کے برابر کوئی گناہ نہیں۔

ایک بڑھ چڑھ کر لیکن محبوبیت اور خلافت کی خلعت فاخرہ ضعیف البنیان انسان ہی کے جسم پر راست آنے والی تھی، وہ بے شک ملائکہ کی طرح معصوم نہیں، اس سے گناہوں کا صدور مستبعد نہیں لیکن خالق کی نظر عنایت سب کی تلافی کے لئے کافی ہے اور یہ وہ پاسنگ ہے کہ ترازو کے جس پلڑے میں رکھ دیا جائے، وہ پلڑا جھک جائے گا، فرماتے ہیں :-

٭ موجودات بسیار بودند مصنوعات	موجودات بہت اور مصنوعات
بے شمار لیکن با ہیچ موجودے ایں کار	بے شمار تھے، لیکن کسی ہستی کے ساتھ
نبود کہ آب و گل چوں رب العزت خواست	وہ معاملہ نہیں تھا، جو اس مٹی پانی
کہ نقطۂ خاک را لباس وجود پوشاند	کے مجموعے کے ساتھ تھا جب رب العزت
و بر سر پر خلافت بنشاند ملائکہ ملکوت	کو منظور ہوا کہ اس خاکی پتلے کو وجود
گفتند "اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا"	کا لباس پہنائے، اور خلافت کے
لطف قدیم جواب داد "لیس فی	تخت پر بٹھائے، ملائکہ ملکوت نے عرض کیا کہ:-
الحب مشورۃ" عشق و تدبیر بہم	"آپ زمین میں ایک ایسی ہستی کو خلیفہ بنا کر بھیجنا
جمع نشوند تسبیح و تہلیل شما را چہ خطر	چاہتے ہیں، جو اس میں فساد برپا کرے گی"
اگر قبول ما نبود و ایشاں را از گناہ	لطف قدیم نے جواب دیا، محبت میں مشورہ
چہ ضرر چوں ساقی لطف ما قدح	نہیں ہوتا، اور عشق و تدبیر جمع نہیں ہوتے
عفو در دست ایشاں نہد "فاولئک	تمہاری تسبیح و تہلیل کی کیا قیمت ہے،
یبدل اللہ سیئاتھم حسنات" بلے	اگر ہمیں قبول نہ ہو اور ان کو گناہوں سے
شما راست روید و ایشاں ہر گونہ	کیا نقصان اگر ہمارے لطف و عنایت
روند لیکن چوں بایشاں را نخواستم	کا ساقی عفو و معافی کا پیمانہ ان کے ہاتھ پر

بساط رحمت گستردیم اگر بر جبین	رکھ دے پس اللہ تعالیٰ ان کی برائیوں کو
خطے از معصیت پدید آید محبت ما آنرا	بھلائیوں سے تبدیل کر دے گا، ہاں تم ہمیشہ
بلطف بردارد شماآں می بینید کہ سرو کار	سیدھے راستے پر چلنے والے ہوا ور وہ
ایشاں باماست در معالمت آں نمی	ہر طرف چلیں گے لیکن جب ہم نے ان کو
بینید کہ سرو کار ما با ایشان است	چاہا، تو رحمت کا فرش ان کے لئے بچھایا،
در محبت چنانکہ قائلے گفتہ است۔	اگر ان کی پیشانی پر گناہ کوئی لکیر ڈال دے گا
شعر	ہماری مہربانی اس کو مٹا دیگی تم یہ تو دیکھتے ہو کہ
واذا الحبیب أتی بذنب واحد	معاملات میں ہم ان کے مطلوب ہیں اور یہ نہیں
جاءت محاسنہ بألف شفیع[1]	دیکھتے کہ محبت میں وہ ہمارے مطلوب ہیں ــــ

ــــ کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ محبوب سے ایک گناہ سرزد ہوتا ہے تو اس کے محاسن ہزار سفارشی لا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔

امانت محبت

ایک دوسری جگہ انسان کی محبوبیت اور اختصاص کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"مخلوقات دیگر را با محبت کار نبود	دوسری مخلوقات کو محبت سے کوئی
کہ ہمت بلند نداشتند آں کار ملائکہ	سروکار نہ تھا کہ وہ بلند ہمت نہیں رکھتی
کہ راست بینی از آن است کہ با ایشاں	تھیں، ملائکہ کے کام میں جو تم کو یکسانی
حدیث محبت نرفتہ است وایں نیرو	اور یک رنگی نظر آتی ہے، وہ اس وجہ
زیرے کہ در راہ آدمیان می بینی از ان است	سے ہے کہ وہ حدیث محبت کے مخاطب نہیں

کہ بایشاں حدیث محبت رفت کہ
"یحبهم و یحبونه" پس ہر کرشمہ محبت
بمشام اورسیدہ است کو دل از
سلامت بردارد و خود را وداع کند کہ
"المحبۃ لا تبقی ولا تذر"

بیت ؎

عشق تو مرا چنیں خراباتی کرد
ورنے بسلامت وبساماں بودم

چوں نوبت در دولت آدم در آمد
خروشے و جوشے در مملکت افتاد گفتند
چہ افتاد کہ چندیں ہزار سال تسبیح و
تہلیل ما را باد بردند و آدم خاکی
را برکشیدند و برما گزیدند ندا شنیدند کہ
شما بصورت خاک منگرید بداں ودیعت
پاک نگرید کہ "یحبهم و یحبونه" و آتش
محبت در دلہا ایشاں زدہ است[1]

اور یہ جو آدمیوں کے راستے میں نشیب و
فراز نظر آتے ہیں، یہ اس وجہ سے کہ ان
کے ساتھ محبت کا معاملہ ہے، پس جس کے
مشام جاں تک محبت کی خوشبو پہنچی اس کو
چاہیے کہ سلامتی کو سلام کرے اور خود کو وداع
کرے محبت کسی چیز کی روادار نہیں، شاعر نے کہا ہے

عشق تو مرا چنیں خراباتی کرد
ورنے بسلامت وبساماں بودم

جب آدم کی قسمت واقبال کا ستارہ
بلند ہوا تو کائنات میں ایک تلاطم برپا
ہوا کہنے والوں نے کہا کہ اتنے ہزار سال کی
ہماری تسبیح وتہلیل کو نظر انداز کر دیا، اور خاک
کے پتلے آدم کو سرفراز کیا گیا ادھر ہم پر ترجیح
دی گئی، آواز آئی کہ تم اس خاکی صورت
کو مت دیکھو اس پاک جوہر کو دیکھو جو
ان کے اندر ودیعت ہے "یحبهم و
یحبونه" محبت کی آگ ان کے دلوں
میں لگائی گئی ہے۔

---

[1] مکتوب ۔ ۴۶

ایک دوسرے مکتوب میں اس خصوصیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

خدائے عز وجل راہشتاد ہزار عالم	اللہ تعالےٰ نے اٹھارہ ہزار عالم پیدا
است ایں جملہ ازیں حدیث فارغ	کئے لیکن یہ سب مخلوقات حدیث سوزو
اند وحظے ونصیبے ندارند الا آدمی کہ	محبت سے بے تعلق ہیں، اور ان کو اس کا
ایں کرامت ہیچ نوع از انواع	کوئی حصہ نہیں ملا، یہ دولت تو آدمی ہی
موجودات دیگر راندادند ازیں جاست	کے حصے میں آئی موجودات کی دوسری
کہ گفت آنکہ گفت "	اقسام میں سے کسی قسم کو بھی یہ شرف
بیت ؎	عطا نہ ہوا، اسی لئے کسی کہنے والے نے کہا ہے
پناہ بلندی و پستی توئی	پناہِ بلندی و پستی توئی
ہمہ نیستند آنچہ ہستی توئی[1]	ہمہ نیستند آنچہ ہستی توئی

حاصل وجود

ایک دوسرے مکتوب میں آب وگل کی اس قسمت وعزت کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انسان کا حاصل وجود اس پورے نظام خلق وتکوین کا مقصود ہے، اور اس کو محبوبیت و اختصاص حاصل ہے، فرماتے ہیں :۔

اے برادر دولت آب وخاک نہ اندک	میرے بھائی مٹی پانی کا اقبال کچھ کم
است وکار آدم وآدمیان نہ مختصر،	نہیں، اور آدم اور آدمیوں کا مرتبہ
عرش وکرسی ولوح وقلم وآسمان و	معمولی نہیں، عرش وکرسی لوح وقلم آسمان
زمین ہمہ بہ طفیل اوست استادابو علی دقاق	اور زمین سب انسان ہی کے طفیل ہیں

گفت اگر آدم را خلیفہ گفت و خلیل را
"اتخذ اللہ ابراھیم خلیلا"، گفت و
موسیٰ را "واصطنعتک لنفسی" گفت
و ما را "یحبھم و یحبونہ" گفتہ اند
اگر ایں حدیث را باد لہائے مناسبت
نبودے دل خود دل نبودے، و
اگر خورشید محبت بر جانہائے آدم و
آدمیاں نتافتے کار آدم چوں موجودا
دیگر بودے۔[1]

ہیں، استاد ابو علی دقاق رحمۃ اللہ علیہ
فرماتے ہیں کہ اللہ نے آدمؑ کو اپنا خلیفہ
کہا، حضرت ابراہیمؑ کو خلیل اللہ کا لقب
دیا، اور حضرت موسیٰؑ کے لئے ارشاد
ہوا کہ ہم نے تم کو اپنے لئے منتخب کیا،
اور مومنین کے متعلق ارشاد ہے "یحبھم
و یحبونہ" لوگوں نے کہا کہ اگر اس حدیث
محبت کو دلوں سے مناسبت نہ ہوتی
تو دل دل کہلانے کا مستحق نہ ہوتا اور اگر
آفتاب محبت آدم و اولاد آدم کے جان
و دل پر ضیا پاشی نہ کرتا تو آدم کا معاملہ
بھی دوسری موجودات ہی کی طرح ہوتا۔

---

[1] مکتوب ۔ ۴۶ ۔ ماخوذ از تاریخ دعوت و عزیمت ۔ حصہ سوم۔

ہندوستان کے صوفیائے کرام اور ہندوستانی معاشرہ پر ان کا اثر

ہندوستان تصوف کا ایک مرکز و منبع

تصوف کے مشہور اور مرکزی سلسلے اگرچہ ہندوستان سے باہر پیدا ہوئے لیکن ان کو سب سے زیادہ فروغ اور مقبولیت (ہندوستان کے مخصوص حالات اور ہندوستان کے ضمیر و مزاج کی وجہ سے) ہندوستان ہی میں حاصل ہوئی، ان سلاسل تصوف میں بعض ایسی ہندوستانی شاخیں پیدا ہوئیں، جنھوں نے خود مستقل سلاسل کی، اور جداگانہ طریق سلوک و تربیت کی شکل اختیار کرلی، اور ان میں بعض ایسے مجتہد اور مجدد فن... پیدا ہوئے جن کی حیثیت ایک مستقل سلسلہ کے بانی اور امام کی ہے، مشہور سلاسل تصوف طریقۂ قادریہ طریقۂ چشتیہ، طریقۂ نقشبندیہ، طریقۂ سہروردیہ کے علاوہ جنھوں نے ہندوستان آکر بڑی ترقی کی، اور نئے برگ و بار لائے، ایسے طرق سلاسل بھی ہیں، جو خاص ہندوستان ہی کی پیداوار ہیں، اور ان کا انتساب ان شخصیتوں کی طرف ہے، جو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئیں، اور ان کے مشائخ یہیں آسودۂ خاک ہیں، مثلاً طریقۂ مداریہ، طریقۂ قلندریہ، طریقۂ شطاریہ، اور طریقۂ مجددیہ جو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے اور ہندوستان ہی سے باہر گئے۔

گیارھویں صدی سے تقریباً ہندوستان ہی تصوف اور اصلاح باطنی کا علمبردار

نظر آتا ہے، اسی صدی میں امام ربانی شیخ احمد سرہندیؒ اور ان کے صاحبزادے اور جانشین خواجہ معصومؒ سے ایک عالم نے استفادہ کیا، خواجہ محمد معصومؒ کے خلفاء ہندوستان سے باہر افغانستان، ایران وترکستان میں پھیلے ہوئے تھے، تیرہویں صدی کے سلسلۂ مجددیہ کے شیخ حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ کی خانقاہ میں روم، شام، بغداد، مصر، چین، اور حبش، سمرقند و بخارا تک کے لوگ استفادہ کے لئے آتے تھے، ان کے خلیفہ مولانا خالد رومیؒ کے ذریعہ یہ سلسلہ عراق، شام، کردستان اور ترکی میں پھیل گیا، اور ابھی تک ان ممالک میں یہ سلسلہ موجود ہے، چودھویں صدی کے شروع میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کی ذات شیخ العرب والعجم کے لقب سے مشہور ہوئی، اور ان سے اہل حجاز اور حجاز میں آنے والے کثیر التعداد حجاج نے فیض اٹھایا، اس وقت پورے عالم اسلام میں ہندوستان ہی کی بدولت اصلاح باطن کی یہ شمع روشن ہے، اور عشق الٰہی کے سودے کی یہ دوکان قائم ہے، اور اس کو اب بھی اس فن کے بعض کاملین اور مخلصین کی موجودگی سے اس فن میں عالمگیر مرکزیت حاصل ہے، اور وہی اس فن کے طالبین وشائقین کا واحد مرجع ہے۔

تصوف اور صوفیا سے لوگوں کا تعلق اور رجوع عام

ہندوستان میں مسلمانوں کے دور کا آغاز صوفیا کرام ہی کی ذات سے ہوا، خاص طور پر حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے مخلص اور پر زور ہاتھوں سے یہاں چشتی سلسلہ کی مضبوط بنیاد پڑی، اس کے بعد سے خواص وعوام، شاہ ورعیت سبھی نے ان بے غرض اور پاک نفس درویشوں اور مردان خدا سے اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار کیا، اور اس برعظیم کے ایک گوشہ سے لے کر دوسرے گوشہ تک خانقاہوں اور روحانی مرکزوں کا

ایک جال بچھ گیا، مرکزی شہروں کو چھوڑ کر مشکل سے کوئی قابل ذکر قصبہ اور مقام اس سے محروم رہا۔

لوگوں کو ان بزرگوں اور ان کی خانقاہوں سے جو والہانہ عقیدت اور قلبی تعلق تھا، اور ان کی طرف رجوع کی جو کیفیت تھی، اس کا ہلکا سا اندازہ ان اعداد و واقعات سے ہو سکتا ہے، جو بغیر کسی ترتیب کے یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

حضرت سید آدم بنوریؒ (متوفی ۱۰۵۳ھ) کی خانقاہ میں ایک ایک ہزار آدمی روزانہ ہوتے تھے، جو دونوں وقت خانقاہ میں کھانا کھاتے تھے، ان کی سواری کے ساتھ ہزاروں ہزار آدمی اور سیکڑوں علماء ہوتے تھے، "تذکرۂ آدمیہ" میں ہے کہ ۱۰۵۲ھ میں جب آپ لاہور تشریف لے گئے تو سادات و مشائخ اور دوسرے طبقوں کے دس ہزار آدمی آپ کے ہمرکاب تھے، طالبین کا اتنا مجمع ہر وقت رہتا تھا کہ شاہجہاں کو ان کی طرف سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا، اس نے کچھ رقم بھیج کر کہلوایا کہ آپ پر حج فرض ہو گیا ہے آپ حرمین تشریف لے جائیں، چنانچہ آپ ہندوستان سے ہجرت کر گئے۔

مجدد صاحب کے نامور خلیفہ اور صاحبزادے حضرت خواجہ محمد معصوم (م ۱۰۷۹ھ) کے ہاتھ پر ۹ لاکھ انسانوں نے بیعت و توبہ کی اور سات ہزار آدمی خلافت سے مشرف ہوئے۔

سر سید احمد خاں مرحوم "آثار الصنادید" میں حضرت شاہ غلام علیؒ کے متعلق لکھتے ہیں۔

"حضرت کی خانقاہ میں پانچ سو سے کم فقیر نہیں رہتا تھا، اور سب کا روٹی کپڑا آپ کے ذمہ تھا۔"

تیرھویں صدی کے مشہور مصلح اور شیخ طریقت حضرت سید احمد شہیدؒ کی طرف لوگوں کے رجوع اور اہل طلب کے ہجوم کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے اصلاحی دوروں اور سفر حج

کے سلسلے میں جن مقامات سے گذرے پورے پورے شہروں میں تھوڑے آدمی ایسے ہوں گے جو توبہ وبیعت سے محروم رہ گئے ہوں، الٰہ آباد، مرزاپور، بنارس، غازی پور، عظیم آباد پٹنہ اور کلکتہ میں مجموعی اعتبار سے کئی لاکھ مسلمانوں نے بیعت وتوبہ کی، دین کی عمومی اہمیت اور طلب کا اندازہ اس سے ہوگا کہ بنارس میں ہسپتال کے مریضوں نے بھی پیغام بھیجا کہ ہم معذور ہیں، وہاں تک ہمارا آنا دشوار ہے، اگر آپ للّٰہ فی اللّٰہ یہاں تشریف ارزانی فرمائیں توہم بیعت کریں، کلکتہ میں دو مہینے قیام رہا روزانہ ایک ہزار آدمی کے قریب بیعت سے مشرف ہوتے، اور روز بروز ہجوم بڑھتا جاتا تھا، کثرت بیعت کا یہ حال تھا کہ صبح سے دو ڈھائی پہر رات گئے تک مردوں اور عورتوں کا ہجوم رہتا، سید صاحب کو سوائے نماز پڑھنے اور کھانا کھانے اور ضروریات بشری کے کچھ فرصت نہ ملتی، علیحدہ علیحدہ ایک ایک شخص سے بیعت لینا محال تھا، ایک وسیع مکان میں سب جمع ہوجاتے، آپ تشریف لاتے، سات آٹھ دستاریں کھول کر آپ لوگوں کے ہاتھ میں دے دیتے، لوگ ان کو جابجا سے تھام لیتے، اور آپ بیعت کے الفاظ کو اذان کی طرح بلند آواز سے تلقین فرماتے، دن میں سترہ اٹھارہ بار یہی عمل ہوتا۔

زندگی اور معاشرہ پر اثر

یہ مشائخ ان لوگوں سے جو ان کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے، تمام گناہوں سے توبہ لیتے تھے، خدا کی اطاعت اور رسول کی تابعداری کا عہد لیتے تھے، بے حیائی اور بداخلاقی ظلم وزیادتی، حقوق العباد کی پامالی سے بچنے کی تاکید فرماتے، اچھے اخلاق اختیار کرنے، اور اخلاق رذیلہ (حسد، کینہ، تکبر، حب مال، حب جاہ) کے ازالہ اور اصلاح کی طرف

توجہ دلاتے تھے، خدا کی یاد اور اس کی مخلوق کے ساتھ خیر خواہی اور خدمت اور لوگوں کو نفع پہونچانے اور ایثار و قناعت کی تعلیم دیتے تھے اس بیعت کے علاوہ جو عام طور پر ایک خصوصی اور گہرے تعلق کا ذریعہ ہوتی تھی، وہ تمام آنے جانے والوں کو وعظ و نصیحت کرتے تھے، ان کے اخلاص و اخلاق اور ان کی تعلیم و تربیت، اور صحبت کا جو اثر عام زندگی اور معاشرہ پر ہوتا تھا، اس کا ایک نمونہ یہاں پیش کیا جاتا ہے، ہندوستان کا مشہور مؤرخ قاضی ضیاء الدین برنی عہد علائی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"سلطان علاء الدین کے زمانے کے مشائخ میں سے سجادۂ تصوف شیخ الاسلام نظام الدین، شیخ الاسلام علاء الدین اور شیخ الاسلام رکن الدین سے آراستہ تھا، ایک دنیا ان کے انفاس متبرکہ سے روشن ہوئی، اور ایک عالم نے ان کی بیعت کا ہاتھ پکڑا، اور ان کی مدد سے گنہگاروں نے توبہ کی، اور ہزاروں بدکاروں اور بے نمازیوں نے بدکاری سے ہاتھ اٹھالیا، اور ہمیشہ کے لئے پابند نماز ہو گئے، اور باطنی طور پر دینی شغلہ کی طرف رغبت ظاہر کی، اور ان کی توبہ صحیح ہو گئی، عبادات لازمہ اور متعدیہ کا معمول ہو گیا، دنیا کی حرص و محبت (جو انسانوں کے فوائد اور فرمانبرداری کی بنیاد ہے) ان مشائخ کے اخلاق حمیدہ اور ترک و تجرید کے معاملہ کو دیکھنے سے دلوں سے کم ہو گئی، ان بزرگوں کی عبادات و معاملات کی برکت سے لوگوں میں سچائی پیدا ہو گئی، ان کے مکارم اخلاق، ریاضات و مجاہدات کے اثر سے اللہ والوں کے دلوں میں اخلاق کے بدلنے کی خواہش پیدا ہوئی"

آگے چل کر لکھتا ہے:۔

"عہد علائی کے آخری چند سالوں میں شراب، معشوق، فسق و فجور، جوا، فحاشی

وغیرہ کا نام اکثر آدمیوں کے زبانوں پر نہیں آنے پایا، بڑے بڑے گناہ لوگوں کے نزدیک کفر کے مشابہ معلوم ہونے لگتے تھے، مسلمان ایک دوسرے کی شرم سے سود خوری اور ذخیرہ اندوزی کے کھلم کھلا مرتکب نہیں ہوسکتے تھے، بازار والوں کے جھوٹ بولنے، کم تولنے، اور آمیزش کرنے کا رواج اٹھ گیا تھا۔"[1]

"مشائخ طریقت اپنے مریدین کو معاملات کی صفائی، حق داروں کے حقوق کے تصفیہ اور ان کے ذمہ کسی کے مطالبات یا بقایا ہے تو اس کی ادائیگی کی شدید تاکید کرتے تھے، سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا کو بھی ان کے شیخ خواجہ فریدالدین گنج شکر نے تاکید فرمائی تھی کہ "مخالفین کو خوش کرنے اور اہل حقوق کو راضی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرنا، ان کے ذمہ ایک شخص کے ۲۰ جیتل باقی تھے، اور ایک شخص سے انھوں نے ایک کتاب مستعار لی تھی، وہ کھو گئی تھی، جب وہ دہلی آئے تو پہلے شخص کے پاس قرض ادا کرنے گئے، اس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم مسلمانوں کے پاس سے آرہے ہو، دوسرے شخص کے پاس گئے تو اس نے کہا کہ "ہاں تم جہاں سے آرہے ہو وہاں کا نتیجہ یہی ہونا چاہئے"۔[2]

ان مشائخ کی تربیت و صحبت سے بلا تفریق مذہب و ملت، وامتیاز یگانہ و بیگانہ خدمت اور راحت رسانی کا جذبہ اور ذوق پیدا ہوتا تھا، حضرت سید احمد شہیدؒ اپنے کثیر التعداد رفقاء کے ساتھ سفر حج کو جارہے تھے، تو اس طویل و پر مشقت سفر میں جہاں ضرورت پڑتی، اور خدمت کا کوئی موقع آتا، اس سے دریغ نہ کرتے، یہ سفر دریائے گنگا کے راستہ کشتیوں سے ہو رہا تھا، مرزا پور کے گھاٹ پر روئی سے لدی ہوئی ایک ناؤ

---

[1] ماخوذ از "بزم صوفیا" باختصار ص۲۰۲ و ص۱۹۸ [2] فوائد الفواد" ص۱۴۰

کھڑی تھی، روئی کا مالک مزدوروں کا منتظر تھا، کہ اس روئی کو لاد کر گودام لے جائے، سید صاحب نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ روئی کے گٹھے اتار لو، صدہا آدمی اس کشتی سے لپٹ گئے، اور دو گھڑی کے عرصہ میں ناؤ خالی کر کے روئی گودام کے دروازے پر پہنچادی، لوگ یہ حال دیکھ کر متحیر ہو گئے، اور آپس میں کہنے لگے یہ لوگ تو عجیب طرح کے ہیں کہ روئی والے سے نہ جان نہ پہچان، بے مزدوری للہ فی اللہ اس کا اتنا کام کر دیا بے شک یہ لوگ اللہ والے ہیں[1]!!

تسلسل کے ساتھ ان مشائخ کرام کے اثرات کا تذکرہ بہت دشوار ہے، اس کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے، ہندوستان میں صحت مند صاحب ضمیر معاشرہ تعمیر کرنے میں (جو اس ملک کی سب سے بڑی اخلاقی طاقت، بے غرض خادمان خلق اور نیک نفس حکام کا سرچشمہ رہی ہے، اور جس نے ہر نازک موقع پر ہندوستان کو لائق افراد فراہم کئے ہیں) ان بے لوث مصلحین اور معلمین اخلاق کا سب سے بڑا اور مرکزی حصہ ہے، درمیان کی صدیوں کو ہم چھوڑ کر جن کا وسیع مواد مشائخ طریقت کے تذکروں میں منتشر ہے، ہم تیرھویں صدی کے صرف ایک روحانی پیشوا حضرت سید احمد شہیدؒ کے دینی و اخلاقی اثرات کا تذکرہ بطور مثال کے پیش کرتے ہیں، سید صاحب کے سفر حج کا تذکرہ کرتے ہوئے مؤرخ لکھتا ہے:۔

> ● کلکتہ میں یک لخت شراب بکنی موقوف ہو گئی، دوکانداروں نے جا کر سرکار انگریزی میں اس کا شکوہ کیا کہ ہم لوگ سرکاری محصول بلا عذر ادا کرتے ہیں، اور دوکانیں ہماری بند ہیں، جب سے ایک بزرگ اپنے قافلہ کے ساتھ اس شہر میں آئے ہیں، شہر اور دیہات

---

[1] سیرت سید احمد شہید ص ۲۴۹ بحوالہ وقائع احمدی قلمی ص ۱۲۴۶

کے تمام مسلمان ان کے مرید ہوئے، اور ہر روز بڑھتے جاتے ہیں، انھوں نے کل مسکرات (نشہ آور چیزوں) سے توبہ کی ہے، اب کوئی ہماری دوکانوں کی طرف ہو کر بھی نہیں نکلتا۔"[1]

اس وسیع ملک کی آبادی کی جس کثیر تعداد کو ان مشائخ طریقت اور روحانی معلمین کے تعلق اور ان کی اصلاحی کوششوں نے نیک راستے پر لگایا، اور بداخلاقیوں اور بداعمالیوں سے مجتنب رکھا وہ صرف انھیں کے اخلاق و روحانیت کا نتیجہ تھا، دنیا کی کوئی حکومت، کوئی ادارہ، کوئی قانون، نہ اتنی بڑی تعداد کو متاثر کرسکتا ہے، اور نہ دائمی طور پر اخلاق و اصول کے دائرہ میں رکھ سکتا ہے۔

بے رعبی اور حق گوئی

ان روحانی معلمین کی ایک بڑی خدمت اور کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے مطلق العنان سلاطین اور جابر بادشاہوں کے غلط اور خطرناک رجحانات اور بے اعتدالیوں کا مقابلہ کیا، ان کے منہ پر کلمہ حق کہہ کر اور ان سے اختلاف ظاہر کر کے حکومت اور معاشرہ کو بعض خطرناک نتائج اور تباہی سے بچالیا، ان کی تربیت اور عملی مثالوں نے لوگوں میں ہمت اور حوصلہ اور بے خوفی و شجاعت پیدا کی، ہندوستان کے اسلامی دور کی پوری تاریخ ان مثالوں سے بھری ہوئی ہے کہ ان مشائخ اور ان کے خلفاء نے سر سے کفن باندھ کر اور اپنی زندگی سے ہاتھ دھو کر "افضل الجهاد کلمة حق عند سلطان جائر" (جابر بادشاہ کے مقابلہ میں حق بات کہنا افضل ترین جہاد ہے) پر عمل کیا، یہاں پر صرف محمد تغلق کے عہد کے دو واقعات نقل کئے جاتے ہیں۔

---

[1] وقائع احمدی۔

شیخ قطب الدین منور محمد تغلق کے عہد کے ایک گوشہ نشین چشتی بزرگ تھے، بادشاہ ان کے علاقہ کے پاس سے گذرا اور انھوں نے سلام کے لئے حاضری نہیں دی، بادشاہ نے ان کو دہلی طلب کیا، انھوں نے جب ایوان شاہی کی دہلیز پر قدم رکھا، تو امراء و ملوک اور نقیب و چاؤش دورویہ کھڑے تھے، ان کے صاحبزادے نور الدین کم عمر تھے، انھوں نے کبھی بادشاہوں کی بارگاہ نہیں دیکھی تھی، ان پر ہیبت سی طاری ہوئی، شیخ قطب الدین منور نے ان سے پکار کر کہا، بابا نور الدین" العظمۃ للہ" صاحبزادے کا بیان ہے کہ یہ سنتے ہی میرے اندر ایک قوت پیدا ہوگئی، سارا رعب جاتا رہا، اور جو امراء و ملوک وہاں کھڑے تھے، وہ مجھے بالکل بکریوں کی طرح معلوم ہونے لگے، بادشاہ نے شکوہ کیا کہ میں آپ کے جوار میں پہنچا آپ نے میری کوئی تربیت نہ فرمائی، اور اپنی ملاقات سے عزت نہ بخشی، شیخ نے فرمایا کہ یہ درویش اپنے کو اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ بادشاہوں سے ملاقات کرے، ایک کونہ میں پڑا ہوا، بادشاہ اور اہل اسلام کی دعا گوئی میں مصروف ہے، اس کو معذور سمجھا جائے، ان کی ملاقات کے بعد بادشاہ نے ایک امیر سے کہا کہ مجھے جن بزرگوں سے مصافحہ کا اتفاق ہوا ہے، جس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اس کے ہاتھ میں کپکپی تھی، لیکن شیخ منور نے اتنی مضبوطی سے مصافحہ کیا کہ ان پر ذرا اثر نہیں معلوم ہوتا تھا، بادشاہ نے ان کی خدمت میں ایک لاکھ تنکہ پیش کیا، شیخ نے فرمایا کہ سبحان اللہ! درویش کو تو دو سیر چاول دال اور ایک پیسہ کا گھی کافی ہے، وہ ان ہزاروں روپیوں کو کیا کرے گا، بڑی کوششوں اور حیلوں سے یہ کہہ کر بادشاہ درپے آزار ہو جائے گا، آپ نے دو ہزار تنکے قبول کئے، اور وہ بھی اپنے برادران طریقت اور اہل حاجت میں تقسیم کر کے واپس چلے آئے۔[1]

---

[1] سیر الاولیاء، ص ۲۵۵، ۲۵۳

دوسرا واقعہ مولانا فخر الدین زرّادی کا ہے، مولانا کو سلطان کی ملاقات سے بہت اجتناب تھا، کئی بار فرمایا کہ میں اپنے سر کو اس شخص کے دربار میں کٹا ہوا اور پڑا ہوا دیکھتا ہوں، یعنی میں کلمۂ حق کہنے سے باز نہیں رہوں گا، اور یہ شخص مجھے معاف نہیں کریگا آخر ایک مرتبہ دربار میں مجلس ہوئی، سلطان نے کہا کہ ہمیں کچھ نصیحت کیجئے، مولانا نے فرمایا غصہ دبایئے، سلطان نے کہا کون سا غصہ، مولانا نے فرمایا درندوں والا غصہ اس پر سلطان کا چہرہ تمتما گیا، لیکن کچھ کہا نہیں، خاصۂ شاہی طلب کیا گیا، سلطان نے اپنے پیالہ میں مولانا کو شریک کیا، اور اپنے ہاتھ سے بعض لقمے دیئے، مولانا نے بڑی ناگواری کے ساتھ کھانا کھایا، سلطان نے اس کے بعد مولانا کو رخصت کیا۔[۱]

ان مشائخ نے شخصی سلطنت کے ہر دور میں اپنی بے غرضی، بے خوفی، اور حق گوئی کی روایت قائم رکھی، اور جبکہ سلاطین نے حق گو علماء تک کو معاف نہیں کیا، انھوں نے عام حالات میں ان درویشوں کی خصوصی رعایت کی اور ان کو اپنا فرض انجام دینے کی اجازت دی، دہلی کے آخری دور میں بھی مشائخ نے اپنی خودداری، خودشناسی ہاتھ سے جانے نہیں دی، شاہ عالم ایک مرتبہ خواجہ میر درد کی محفل سماع میں حاضر ہوئے، چونکہ پاؤں میں درد تھا، ضبط نہ کر سکے، ذرا پاؤں پھیلا دیا، خواجہ صاحب اس بے ادبی کے متحمل نہ ہو سکے، فرمایا، یہ امر فقیر کی داب محفل کے خلاف ہے، بادشاہ نے عذر کیا اور معافی چاہی، خواجہ صاحب نے فرمایا اگر طبیعت ناساز تھی تو تکلیف کرنا کیا ضرور تھی۔[۲]

زہد و استغناء

ان صوفیائے کرام نے سلطنت کے عہدوں، امراء اور اہل دولت کے گراں قدر

---

[۱] سیر الاولیاء ص ۲۷۲، ۲۷۱ [۲] گل رعنا ص ۱۷۱

پیش کشوں اور زمین وجائیداد کے قبول کرنے سے اکثر پرہیز کیا، اور زہد واستغنا، قناعت وتوکل، اور خودداری وخودشناسی کی ایسی روایت قائم رکھی جس نے ہندوستان کے معاشرہ میں کردار کی مضبوطی، بلند ہمتی اور بلند نظری کے اوصاف اور عناصر کو زندہ رکھا اور انسانیت کی آبرو کو سود و زیاں کے اس بازار میں جس میں انسانوں کا سودا ہوا کرتا تھا، ہمیشہ قائم ومحفوظ رکھا، ان کا اصول زندگی اور اعلان یہ تھا۔

من دلق خود بافسر شاہاں نمی دہم   من فقر خود بملک سلیماں نمی دہم

از رنج فقر در دلے گنجے کہ یافتم   ایں رنج را براحت شاہاں نمی دہم

(میں اپنی گدڑی بادشاہوں کے تاج کے عوض میں دینے کو تیار نہیں ہوں، میں اپنا فقر سلطنت سلیماں کے بدلے میں نہیں دے سکتا، فقر کی مشقت سے میں نے دل میں جو خزانہ پایا، اس مشقت کو میں بادشاہوں کے آرام کے عوض دینے کو تیار نہیں ہوں۔)

ہندوستان کے فقر وتصوف کی تاریخ، زہد واستغنا خودداری وخودشناسی اور ایثار وقربانی کے حیرت انگیز واقعات سے لبریز ہے، اور ان مثالوں سے کسی سلسلۂ طریقت، اور کسی خانوادۂ تصوف کی تاریخ خالی نہیں، ہم یہاں صرف آخری دو، تیرھویں و چودھویں صدی کے چند واقعات نقل کرتے ہیں، جو اس دور سے تعلق رکھتے ہیں، جس میں مادیت اپنے قدم جما چکی تھی۔

سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے ایک بزرگ حضرت مرزا جان جاناں دہلویؒ تھے، جن کی وفات سے قبل بادشاہ دہلی نے پیغام بھیجا کہ اللہ نے اتنی بڑی سلطنت مجھے عطا کی ہے، آپ اس میں سے کچھ قبول فرمالیں، فرمایا، اللہ تعالیٰ تو ہفت اقلیم کو متاع الدنیا قلیل فرماتا ہے، پھر ایک اقلیم میں سے ایک ولایت آپ کے حصے میں آئی ہے، وہ کتنی ہے کہ فقیر اس کی طرف

طمع کا ہاتھ بڑھائے، نواب آصف جاہ نے ایک بار بیس ہزار روپیہ نذر کیا، آپ نے قبول نہیں فرمایا، نواب نے کہا کہ محتاجوں کو بانٹ دیجئے، فرمایا کہ مجھکو اس کا سلیقہ نہیں یہاں سے نکل کر بانٹتے چلے جائیے، گھر تک پہونچتے تقسیم ہوجائے گا، نہ ہو تو وہاں ہوجائے گا۔

حضرت شاہ غلام علی صاحب دہلویؒ کو نواب میر خاں والی ریاست ٹونک نے ان کی خانقاہ کے سالانہ مصارف کے لئے کچھ مقرر کرنا چاہا، تو ان کو لکھدیا گیا کہ ؎

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم ... با میر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

(ہم فقر و قناعت کی بے آبروئی نہیں کرتے، نواب میر خاں سے کہدو کہ روزی مقدر ہے)

مولانا فضل رحمان گنج مراد آبادیؒ (متوفی ۱۳۱۳ھ) کے پاس ایک بار کوئی انگریز حاکم آیا ہوا تھا، اس نے حضرت کی اخلاقی تقریر سے خوش ہو کر کہا، اگر آپ فرمائیں تو آپ کی خانقاہ کے لئے گورنمنٹ سے کچھ مقرر کرادیں، آپ نے فرمایا کہ:۔

میں تمہاری گورنمنٹ کا پیسہ لے کر کیا کروں گا، خدا کے فضل سے ایک سی کی بنی ہوئی چارپائی، اور دو لوٹے مٹی کے اور دو گھڑے مٹی کے موجود ہیں، اور بعض مرید ہمارے باجرہ لے آتے ہیں، اس کی روٹی ہوجاتی ہے، بی بی صاحبہ کچھ دال یا ساگ پکادیتی ہیں، اس سے لگا کر کھالیتے ہیں۔

مولوی محب اللہ صاحب کا بیان ہے کہ نواب کلب علی خاں والی ریاست رامپور نے خواہش ظاہر کی کہ حضرت مولانا فضل رحمان محدث رامپور ہمارے یہاں تشریف لاویں، اس پر مولوی صاحب نے نواب صاحب سے پوچھا کہ ان کے لئے کیا نذر کریں گے؟ نواب صاحب نے کہا کہ لاکھ روپیہ مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کروں گا، مولوی محب اللہ خانصاحب مراد آباد پہونچے اور عرض کیا کہ رامپور تشریف لے چلئے، نواب کلب علی خاں آپکے بہت

مشتاق ہیں، اور لاکھ روپیہ نذر کریں گے، آپ جس طرح سے بات کر رہے تھے کرتے رہے، اور اس حکایت کو معمولی بات کی طرح ٹال دیا، اور فرمایا: میاں لاکھ روپیہ پر خاک ڈالو اور بات سنو ؎

جو ہم دل پہ اس کا کرم دیکھتے ہیں
تو دل کو بہ از جامِ جم دیکھتے ہیں

اشاعت علم

ہندوستان کے صوفیاء کرام ہمیشہ علم کے سرپرست اور پشت پناہ رہے، ان میں سے اکثر و بیشتر اعلیٰ علمی، ادبی ذوق رکھتے تھے، اور ان کا روزِ اول سے یہ عقیدہ تھا۔

کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

اور یہ کہ جاہل صوفی بازیچۂ شیطان ہوتا ہے، اسی بنا پر انھوں نے بڑے بڑے عالی استعداد طالبین کو اس وقت تک اجازت نہیں دی جب تک کہ انھوں نے اپنی علمی تکمیل نہیں کر لی[1]۔ ....ہندوستان کی تعلیمی تحریک اور یہاں کی علمی چہل پہل بالواسطہ اور بلاواسطہ مشائخ طریقت کی سرپرستی و ہمت افزائی کا نتیجہ ہے، آٹھویں صدی میں ہندوستان کے دو زبردست عالم اور جہاں استاد قاضی عبدالمقتدر کندی اور شیخ احمد تھانیسری، حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی سے وابستہ تھے، گیارہویں صدی کے مشہور مدرس مولانا جمال الاولیاء کوروی جن کے تلامذہ اور شاگردوں کے شاگردوں سے درس و تدریس کا ہنگامہ تیرہویں صدی تک گرم رہا، ایک بلند پایہ شیخ طریقت تھے، بیشتر دوروں میں خانقاہ اور مدرسہ لازم و ملزوم رہے، جون پور کی خانقاہ رشیدیہ،

---

[1] ملاحظہ ہو واقعۂ شیخ سراج الدین اودھی "فوائد الفواد" و "سیر الاولیاء"۔

ٹیلے والی مسجد میں مولانا شاہ پیر محمد صاحب کا مدرسہ، دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی درسگاہ اور گنگوہ میں مولانا رشید احمد صاحب کی خانقاہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

پرورش خلائق

ان مشائخ اور ان کی خانقاہوں کے ذریعہ ہزاروں بندگان خدا کی حاجت برآری ہوتی، کتنے خاندانوں اور گھروں میں ان کی وجہ سے چراغ جلتا اور چولھا گرم ہوتا، کتنے خدا کے بندے ان خانقاہوں میں آکر پیٹ بھر کھانا کھاتے اور انواع واقسام کی لذتوں کا مزہ اٹھاتے، فقیروں کا یہ شاہی دسترخوان ایک خوان یغما تھا جس پر دوست ودشمن، یگانہ وبیگانہ، امیر وغریب شہری وپردیسی کی کوئی قید نہیں تھی، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا دسترخوان اپنی وسعت اور تکلفات کے لئے ضرب المثل تھا، گیارھویں صدی کے ایک مجددی شیخ، شیخ سیف الدین سرہندی کی خانقاہ میں ایک ہزار چار سو آدمی دونوں وقت اپنی فرمائش اور خواہش کے موافق کھانا کھاتے تھے[۱] اسی صدی کے اواخر اور بارھویں صدی کے آغاز میں ایک چشتی شیخ سید محمد سعید عرف شاہ بھیک تھے ان کے متعلق ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ ان کی خانقاہ میں ذاکرین وشاغلین کی تعداد ابتدائی زمانہ میں پانچ سو سے کم نہیں تھی، اسی قدر مجمع آنے جانے والوں میں سے تقریباً ایک ہزار انسان دونوں وقت ان کے یہاں کھانا کھاتے تھے، ایک مرتبہ روشن الدولہ (فرخ سیر کے سہ ہزاری امیر) نے ستر ہزار روپیہ خانقاہ کی تعمیر کے لئے نذر گذرانا، ارشاد ہوا کہ بالفعل اس کو ایک جگہ چھوڑ دیں اور آرام فرمائیں، سہ پہر کو معماروں کو طلب کر کے عمارت کی تیاری

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۵

شروع ہوگی، روشن الدولہ آرام کرنے چلا گیا، شاہ بھیک صاحب نے درویشوں کو طلب کیا اور ساری رقم انبالہ اور تھانیسر سرہند و پانی پت کی بیوہ عورتوں، محتاجوں اور مسکینوں کے گھروں پر بھیجدی، اور ایک حبہ بھی باقی نہ چھوڑا، روشن الدولہ سہ پہر کو آئے تو فرمایا کہ خانقاہ کی تعمیر سے وہ ثواب کہاں ملتا جو ان بیکسوں اور گوشہ نشینوں کی خدمت سے ملا، فقیر کو بلند عمارت سے کیا کام، ایک مرتبہ بادشاہ محمد فرخ سیر، نواب روشن الدولہ اور نواب عبداللہ خاں کے عریضے اور تین لاکھ کی رقم کی ہنڈیاں آئیں، آپ کے حکم سے قرب و جوار کے قصبات اور شرفاء کی آبادیوں میں سب تقسیم کرادیا گیا، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے بالکل صحیح لکھا ہے:-

"غریبوں اور امیروں کے درمیان صوفیائے اسلام کی یہی خانقاہیں درمیانی کڑی کا کام دیتی تھیں، ان بزرگوں کا دربار وہ دربار تھا، جہاں سلاطین بھی خراج داخل کرتے تھے، خود سلطان المشائخؒ کا کیا حال تھا، گذر چکا کہ ولی عہد سلطنت خضر خاں تک اسی دربار کا حلقہ بگوش تھا، علاء الدین جو سارے ہندوستان سے خراج وصول کرتا تھا، لیکن ایک خزانہ وہ بھی تھا جس میں اسے بھی مال گذاری داخل کرنی پڑتی تھی،......

یہی خانقاہیں تھیں، جن کے ذریعہ سے ملک کے عام غرباء و فقراء تک ان کا حصہ پہونچ جاتا تھا، اور یہی مطلب ہے، اس مشہور فقرہ کا کہ "مال صوفی سبیل است"

غربت و امارت کا یہ سنگم یعنی صوفیۂ صافیہ کا یہ طبقہ جہاں امراء و غرباء دونوں ایک حیثیت سے حاضر ہوتے تھے، اس سے غریب حاجتمند مسلمانوں کی کتنی حاجت روائیاں ہوتی تھیں، واقعہ یہ ہے کہ اسلامی عہد کا کوئی زمانہ اور ان دنوں ہندوستان کا شاید ہی کوئی صوبہ، کوئی علاقہ ایسا ہوگا جہاں:-

توخذ من اغنیاءھم وترد علی — ان کے دولت مندوں سے لیا جائے اور

فقرا ہم۔ ان کے ضرورت مندوں کو پہونچا دیا جائے

کے فرمان نبوی کی تعمیل میں ارباب صدق وصفا کا یہ طبقہ مشغول نہ تھا، خصوصاً جن بزرگوں

کا کسی خاص وجہ سے امراء وارباب ثروت پر اثر قائم ہو جاتا تھا، یا یوں کہیئے کہ غرباء

کی قسمت جاگ اٹھتی تھی۔[۱]

انسانیت کی پناہ گاہیں

ان صوفیائے کرام کی تعلیم وصحبت سے لوگوں میں انسانوں سے بلا تفریق مذہب

وملت وبلا تخصیص نسل ونسب، محبت کرنے، ان کی خدمت کرنے اور ان کے درد اور

دکھ کو دور کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا، ان کا اس ارشاد نبوی پر ایمان بھی تھا اور عمل بھی کہ "الخلق

عیال اللہ فاحبھم الی اللہ انفعھم لعیالہ" مخلوق خدا کا کنبہ ہے، خدا کو اپنے بندوں

میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے، جو اس کے کنبہ کے سب سے زیادہ کام آنے والا ہے، وہ

ساری دنیا کے غم خوار تھے، اور بجا طور پر کہہ سکتے تھے کہ ؎

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے ایک مرتبہ اپنا حال بیان کیا کہ جو شخص میرے

پاس آتا ہے، اور اپنا حال مجھ سے بیان کرتا ہے، اس سے دوچند فکر وتردد وغم والم مجھے

ہوتا ہے۔[۲] ایک مرتبہ فرمایا "قیامت کے بازار میں کسی سودے کی اتنی قیمت اور پوچھ گچھ

نہ ہوگی جتنی دلداری اور دل خوش کرنے کی۔"[۳]

اس کا نتیجہ تھا کہ شکستہ دلوں کو ان خانقاہوں میں پناہ بھی ملتی تھی، اور دل کا مرہم

۱؎ نظام تعلیم وتربیت صفحہ ۲۲۰ ۲؎ سیر العارفین قلمی ۳؎ سیر الاولیاء ص ۲۸

بھی، ان مشائخ کی آغوش شفقت ان مشائخ کے لئے کھلی ہوئی تھی، جن کو حکومت یا سوسائٹی یا خاندان نے اپنے دائرہ سے نکالدیا تھا، یا اقبال نے ان سے منھ موڑ لیا تھا، جن کو اعزہ واقارب اور بعض اوقات اولاد تک جواب دے دیتی، وہ ان بزرگوں کے قدموں میں آکر پڑ جاتے اور گھر کا سارا آرام اٹھاتے، ہر مذہب کا آدمی یہاں اپنے دل کی بے چینی اور دماغ کی الجھن دور کرتا، اور غذا اور دوا، محبت اور قدر سب کچھ پاتا، خواجہ نظام الدین اولیاء کو جب ان کے شیخ نے دہلی کی طرف رخصت کیا تو فرمایا کہ "تم ایک سایہ دار درخت ہو گے، جس کے سایہ میں اللہ کی مخلوق آرام پائے گی[1]" چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ستر برس تک دہلی اور دور دراز کے گوشوں سے آنے والوں نے اس درخت کی گھنی چھاؤں میں آرام کیا، ان صوفیاء کرام کی بدولت ہندوستان کے صدہا مقامات پر ایسے "سایہ دار درخت" موجود تھے، جن کی چھاؤں میں تھکے ہارے مسافر اور بھولے بھٹکے قافلے آرام پاتے تھے، اور نئی زندگی اور تازگی حاصل کرتے تھے[2]۔

---

[1] ماخوذ از "ہندوستانی مسلمان" از مصنف۔ [2] سیر الاولیاء

اہل تصوّف اور دینی جدوجہد

دنیا میں بہت سی چیزیں بعض خاص اسباب کی بنا پر بغیر علمی تنقید و تحقیق کے تسلیم کرلی جاتی ہیں، اوران کو ایسی شہرت و مقبولیت حاصل ہوجاتی ہے کہ اگرچہ ان کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہوتی، مگر خواص بھی ان کو زبان و قلم سے بے تکلف دہرانے لگتے ہیں۔

انھیں مشہورات بے اصل میں سے یہ بات بھی ہے کہ تصوف تعطل و بے عملی، حالات سے شکست خوردگی اور میدان جدوجہد سے فرار کا نام ہے لیکن عقلی و نفسیاتی طور پر بھی اور علمی اور تاریخی حیثیت سے بھی ہمیں اس دعوے کے خلاف مسلسل طریقہ پر داخلی و خارجی شہادتیں ملتی ہیں۔

"سیرت سید احمد شہیدؒ" میں تزکیہ و اصلاحِ باطن کے عنوان کے ماتحت خاکسار راقم نے حسب ذیل الفاظ لکھے تھے، جس میں آج بھی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، اور اس حقیقت پر پہلے سے زیادہ یقین پیدا ہوگیا ہے۔

"یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سرفروشی، و جاں بازی، جہاد و قربانی اور تجدید و انقلاب و فتح و تسخیر کے لئے جس روحانی و قلبی قوت جس وجاہت و شخصیت جس اخلاق و للّٰہیت، جس جذب و کشش اور جس حوصلہ و ہمت کی ضرورت ہے، وہ بسا اوقات

روحانی ترقی، صفائیٔ باطن، تہذیب نفس، ریاضت وعبادت کے بغیر نہیں پیدا ہوتی اس لئے آپ دیکھیں گے کہ جنھوں نے اسلام میں مجدّدانہ یا مجاہدانہ کارنامے انجام دیئے ہیں، ان میں سے اکثر افراد روحانی حیثیت سے بلند مقام رکھتے تھے، ان آخری صدیوں پر نظر ڈالئے، امیر عبدالقادر الجزائری مجاہد جزائر، محمد احمد السوڈانی (مہدی سوڈانی) سید احمد شریف السنوسی (امام سنوسی) کو آپ اس میدان کا مرد پائیں گے، حضرت سید احمد ایک مجاہد قائد کے علاوہ اور اس سے پہلے ایک عزیز القدر روحانی پیشوا اور بے مثل شیخ الطریقت تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مجاہدات وریاضات، تزکیۂ نفس، اور قربِ الٰہی سے عشقِ الٰہی اور جذب وشوق کا جو مرتبہ حاصل ہوتا ہے، اس میں ہر رونگٹے سے یہی آواز آتی ہے ؎

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر
مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں

اس لئے روحانی ترقی اور کمال باطنی کا آخری لازمی نتیجہ شوقِ شہادت ہے، اور مجاہدے کی تکمیل جہاد ہے"۔[1]

نفسیاتی پہلو سے غور کیجیے گا تو معلوم ہوگا کہ یقین اور محبت ہی وہ شہپر ہیں، جن سے جہاد وجد وجہد کا شہباز پرواز کرتا ہے، مرغوبات نفسانی، عادات، مالوفات، مادی مصالح ومنافع، اغراض وخواہشات کی پستیوں سے وہی شخص بلند ہو سکتا ہے، اور "لکنہ أخلد إلی الارض واتبع ھواہ" کے دامِ ہمرنگ زمین سے وہی شخص بچ سکتا ہے، جس میں کسی حقیقت کے یقین اور کسی مقصد کے عشق نے پارہ کی "تقدیر سیمابی" اور بجلیوں

---

[1] سیرت سید احمد شہیدؒ

کی بیتابی پیدا کردی ہو۔

انسانی زندگی کا طویل ترین تجربہ ہے کہ محض معلومات و تحقیقات اور مجرد قوانین و ضوابط، اور صرف نظم و ضبط سرفروشی و جانبازی، بلکہ سہل تر ایثار و قربانی کی طاقت و آمادگی پیدا کرنے کے لئے بھی کافی نہیں ہے، اس کے لئے اس سے کہیں زیادہ گہرے اور طاقتور تعلق اور ایک ایسی روحانی لالچ اور غیر مادی فائدے کے یقین کی ضرورت ہے کہ اس کے مقابلے میں زندگی بار دوش معلوم ہونے لگے، کسی ایسے ہی موقع اور حال میں کہنے والے نے کہا تھا ؎

جان کی قیمت دیارِ عشق میں ہے کوئے دوست
اس نویدِ جاں فزا سے سروبالِ دوش ہے

اس لئے کم سے کم اسلام کی تاریخ میں ہر مجاہدانہ تحریک کے سرے پر ایک ایسی شخصیت نظر آتی ہے جس نے اپنے حلقۂ مجاہدین میں یقین و محبت کی یہی روح پھونک دی تھی، اور اپنے یقین و محبت کو سیکڑوں اور ہزاروں انسانوں تک منتقل کر کے ان کے لئے تن آسانی اور راحت طلبی کی زندگی دشوار اور پامردی و شہادت کی موت آسان اور خوشگوار بنادی تھی اور ان کے لئے جینا اتنا ہی مشکل ہو گیا تھا جتنا ——— دوسروں کے لئے مرنا مشکل تھا، یہی سرحلقہ وہ امام وقت ہے جس کے متعلق اقبال مرحوم نے کہا ہے ؎

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینہ میں تجھکو دکھا کر رخ دوست
زندگی اور بھی تیرے لئے دشوار کرے
دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

معمولی اور معتدل حالات میں قوموں کی قیادت کرنے والے، فتح و نصرت کی حالت

میں لشکروں کو لڑانے والے ہر زمانے میں ہوتے ہیں، اس کے لئے کسی غیر معمولی یقین و شخصیت کی ضرورت نہیں، لیکن مایوس کن حالات، اور قومی احتضار کی کیفیات میں صرف وہی مردِ میدان حالات سے کش مکش کی طاقت رکھتے ہیں، جو اپنے خصوصی تعلق باللہ اور قوت ایمانی و روحانی کی وجہ سے خاص یقین و کیفیت عشق کے مالک ہوں، چنانچہ جب مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے تاریک وقفے آئے کہ ظاہری علم و حواس و قوت مقابلہ نے جواب دے دیا، اور حالات کی تبدیلی امر محال معلوم ہونے لگی تو کوئی صاحبِ یقین و صاحب عشق میدان میں آیا، جس نے اپنی "جرأت رندانہ" اور "کیفیت عاشقانہ" سے زمانے کا بہتا ہوا دھارا بدل دیا، اور اللہ تعالیٰ نے "يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ" اور "يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا" کا منظر دکھایا۔

تاتاریوں نے جب تمام عالم اسلام کو پامال کر کے رکھ دیا، جلال الدین خوارزم شاہ کی واحد اسلامی سلطنت اور عباسی خلافت کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا، تو تمام عالم اسلام پر یاس و مردنی چھا گئی، تاتاریوں کی شکست ناممکن الوقوع چیز سمجھی جانے لگی، اور یہ مثال زبان و ادب کا جزو بن گئی، کہ "اذا قیل لک ان التتر انہزموا فلا تصدق" (اگر تم سے کوئی کہے کہ تاتاریوں نے شکست کھائی تو کبھی یقین نہ کرنا۔) اس وقت کچھ صاحبِ یقین اور صاحب قلوب مردان خدا تھے، جو مایوس نہیں ہوئے اور اپنے کام میں لگے رہے، یہاں تک کہ تاتاری سلاطین کو مسلمان کر کے صنم خانہ سے کعبہ کے لئے پاسباں مہیا کر دیئے۔

ہندوستان میں اکبر کے دور میں ساری سلطنت کا رخ الحاد و لادینیت کی طرف ہو گیا، ہندوستان کا عظیم ترین بادشاہ ایک وسیع و طاقتور سلطنت کے پورے وسائل و ذخائر کے ساتھ اسلام کا امتیازی رنگ مٹانا چاہتا تھا، اس کو اپنے وقت کے لائق ترین و ذکی ترین افراد اس مقصد کی تکمیل کے لئے حاصل تھے، سلطنت میں ضعف و پیرانہ سالی

کے کوئی آثار ظاہر نہ تھے کہ کسی فوجی انقلاب کی امید کی جا سکے، علم و ظاہری قیاسات کسی خوشگوار تبدیلی کے امکان کی تائید نہیں کرتے تھے، اس وقت ایک درویش بے نوا نے تن تنہا اس انقلاب کا بیڑا اٹھایا اور اپنے یقین و ایمان، عزم و توکل، اور روحانیت و للہیت سے سلطنت کے اندر ایک ایسا اندرونی انقلاب شروع کیا کہ سلطنت مغلیہ کا ہر جانشین اپنے پیشرو سے بہتر ہونے لگا، یہاں تک کہ اکبر کے تخت سلطنت پر بالآخر محی الدین اورنگ زیب نظر آیا، اس انقلاب کے بانی، امام طریقت حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی تھے۔

انیسویں صدی عیسوی میں جب عالم اسلام پر فرنگی "تاتاریوں" یا مجاہدین صلیب کی یورش ہوئی تو ان کے مقابلہ میں عالم اسلام کے ہر گوشہ میں جو مردان کار سر سے کفن باندھ کر میدان میں آئے، وہ اکثر و بیشتر شیوخ طریقت اور اصحاب سلسلہ بزرگ تھے، جن کے تزکیۂ نفس اور سلوک راہ نبوت نے ان میں دین کی حمیت، کفر کی نفرت، دنیا کی حقارت اور شہادت کی موت کی قیمت دوسروں سے زیادہ پیدا کر دی تھی، الجزائر (مغرب) میں امیر عبد القادر نے فرانسیسیوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا، اور ۱۸۳۲ء سے ۱۸۴۷ء تک نہ خود چین سے بیٹھے نہ فرانسیسیوں کو چین سے بیٹھنے دیا، مغربی مؤرخین نے ان کی شجاعت، عدل و انصاف، نرمی و مہربانی اور علمی قابلیت کی تعریف کی ہے۔

یہ مجاہد عملاً و ذوقاً صوفی و شیخ طریقت تھا، اور امیر شکیب ارسلان نے ان الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے:۔

وكان المرحوم الامير عبد القادر	امیر عبد القادر پورے عالم و ادیب
متضلعا من العلم والأدب؛ سامي	عالی دماغ اور بلند پایہ صوفی تھے، صرف
الفكر، راسخ القدم في التصوف	نظری طور پر نہیں بلکہ عملاً اور ذوقاً بھی

لا يكتفي بالنظر، حتى يمارسه عملاً
ولا يحن إليه شوقاً حتى يعرفه ذوقاً
وله في التصوف كتاب سماه (المواقف)
فهو في هذا المشرب من الأفراد
الأفذ، إذ ربما لا يوجد نظيره في المتأخرين[1]

صوفی تھے، تصوف میں ان کی ایک
کتاب (المواقف) ہے، وہ اس سلسلہ
کے یکتائے روزگار لوگوں میں تھے
اور ممکن ہے کہ متاخرین میں ان کی
نظیر دستیاب نہ ہو سکے۔

دمشق کے زمانۂ قیام کے معمولات واوقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

وكان كل يوم يقوم الفجر ويصلي
الصبح في مسجد قريب من داره في
محلة العمارة لا يتخلف عن ذلك
إلا لمرض وكان يتهجد الليل ويعاود
في رمضان الرياضة على طريقة
الصوفية وما زال شأناً للبر والتقوى
والأخلاق الفاضلة الى ان توفي
رحمه الله سنة ۱۸۸۳م[2]

روزانہ فجر کو اٹھتے صبح کی نماز اپنے گھر
کے قریب کی مسجد میں جو محلہ العمارہ میں
واقع ہے پڑھتے، سوائے بیماری کی حالت
کے کبھی اس میں ناغہ نہ ہوتا، تہجد کے عادی
تھے، اور رمضان میں حضرات صوفیہ کے طریقہ
پر ریاضت کرتے، برابر سلوک و تقویٰ اور
اخلاق فاضلانہ پر قائم رہتے ہوئے ۱۸۸۳ء
میں انتقال کیا۔

۱۸۱۳ء میں جب طاغستان[3] پر روسیوں کا تسلط ہوا تو ان کا مقابلہ کرنے والے نقشبندی شیوخ تھے جنھوں نے علم جہاد بلند کیا، اور اس کا مطالبہ اور جدوجہد کی کہ معاملات

---

[1] حاضر العالم الاسلامی ج دوم ص ۱۴۳ [2] ایضاً ص ۱۴۲ [3] طاغستان بحر خزر کے مغربی ساحل پر اسلامی آبادی کا ایک ملک ہے، اگر شمالی قفقاز کو اس کے ساتھ شامل کر دیا جائے تو ۲۰ و ۳۰ لاکھ کے درمیان آبادی ہو گی، ۱۵ھ میں ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں مسلمانوں نے اس کو فتح کیا تھا، اس سے پہلے یہ ملک ایران کے زیر اثر تھا۔

مقدمات شریعت کے مطابق فیصل ہوں' اور قوم کی جاہلی عادات کو ترک کردیا جائے
امیر شکیب ارسلان لکھتے ہیں:۔

وتولی کبر الثورة علماؤهم وشيوخ	اس جہاد کے علمبردار طاغستان کے علماء
الطريقة النقشبندية المنتشرة	اور طریقہ نقشبندیہ کے (جو طاغستان میں
هناك وكانهم سبقوا سائر المسلمين	پھیلا ہوا ہے) شیوخ تھے' ایسا معلوم ہوتا
الى معرفة كون ضررهم هو من	ہے کہ انھوں نے اس حقیقت کو عام مسلمانوں
امرائهم الذين اكثرهم يبيعون	سے پہلے سمجھ لیا تھا کہ اصل نقصان حکام
حقوق الامة بلقب ملك أو أمير	سے ہو رہا ہے' جو خطابات' عہدہ واقتدار
وتبوء كرسی وسرير ورفع علم	جھوٹی قیادت وسرداری' عیش ولذت
كاذب ولذة فارغة باعطاء أوسمة	اور تمغوں اور مرتبوں کی لالچ میں قوم فروشی
ومراتب فثاروا منذ ذلك الوقت	کا ارتکاب کرتے ہیں' یہ سمجھ کر انھوں نے ملکی
على الامراء وعلى الروسية حاميتهم	حکام اور ان کے حامی روسیوں کے خلاف
وطلبوا أن تكون المعاملات وفقا	علم بغاوت بلند کیا اور اس کا مطالبہ کیا کہ
لاصول الشريعة لا للعادات القديمة	معاملات کا فیصلہ شریعت مطہرہ کے
الباقية من جاهلية أولئك الأقوام	مطابق ہو نہ کہ قوم کے قدیم جاہلی عادات
وكان زعيم تلك الحركة غازی محمد	کے' اس تحریک کے قائد غازی محمد تھے' جن کو
الذی یلقبه الروس بقاضی ملا	روسی غازی ملا کے لقب سے یاد کرتے ہیں وہ
وكان من العلماء المتبحرين فی العلوم	علوم عربیہ میں بلند پایہ رکھتے تھے' ان
العربية وله تاليف فی وجوب نبذ	جاہلی عادات کے ترک کرنے کے بارے میں

تلك العادات القديمة المخالفة للشرع إسمه "اقامة البرهان على ارتداد عرفاء طاغستان"۔ | ان کی ایک تصنیف (اقامۃ البرھان علی ارتداد عرفاء طاغستان) (طاغستان کے چودھریوں اور برادری کے سرداروں کے ارتداد کا ثبوت) ہے۔

۱۸۳۲ء میں غازی محمد شہید ہوئے، ان کے جانشین حمزہ بے ہوئے، اس کے بعد شیخ شامل نے مجاہدین کی قیادت سنبھالی، جو بقول امیر شکیب "امیر عبدالقادر الجزائری کے طرز پر تھے، اور مشیخت سے امارت ہاتھ میں لی تھی"۔

شیخ شامل نے ۲۵ برس تک روس سے مقابلہ جاری رکھا، اور مختلف معرکوں میں ان پر زبردست فتح حاصل کی، روسی ان کی شوکت اور شجاعت سے مرعوب تھے، اور چند مقامات کو چھوڑ کر سارے ملک سے بیدخل ہو گئے تھے، ۱۸۴۳ء اور ۱۸۴۴ء میں شیخ نے ان کے سارے قلعے فتح کر لئے، اور بڑا جنگی سامان مال غنیمت میں حاصل کیا، اس وقت حکومت روس نے اپنی پوری توجہ طاغستان کی طرف مبذول کی، طاغستان میں جنگ کرنے کے لئے باقاعدہ دعوت دی، شعراء نے نظمیں لکھیں اور پے در پے فوجیں روانہ کی گئیں، شیخ شامل نے اس کے باوجود بھی مزید دس برس تک جنگ جاری رکھی، بالآخر ۱۸۵۹ء میں اس مجاہد عظیم نے ہتھیار ڈالے۔

تصوف و جہاد کی جامعیت کی درخشاں مثال سیدی احمد الشریف السنوسی کی ہے، اطالیوں نے برقہ و طرابلس کی فتح کے لئے پندرہ ۱۵ دن کا اندازہ لگایا تھا، نوآبادیوں اور بادیوں کی جنگ کا تجربہ رکھنے والے انگریز قائدین نے اس پر تنقید کی اور کہا کہ یہ اطالویوں کی ناتجربہ کاری ہے، اس مہم میں ممکن ہے، تین مہینے لگ جائیں، لیکن

نہ پندرہ دن نہ تین مہینے، اس جنگ میں پورے تیرہ برس لگ گئے، اور اطالوی پھر بھی اس علاقہ کو مکمل طریقہ پر سر نہ کر سکے، یہ سنوسی درویشوں اور ان کے شیخ طریقت سیدی احمد الشریف السنوسی کی مجاہدانہ جدوجہد تھی، جس نے اطالیہ کو پندرہ سال تک اس علاقے میں قدم جمانے نہیں دیا، امیر شکیب ارسلان نے لکھا ہے کہ سنوسیوں کے کارنامہ نے ثابت کر دیا کہ طریقۂ سنوسیہ ایک پوری حکومت کا نام ہے، بلکہ بہت سی حکومتیں بھی ان جنگی وسائل کی مالک نہیں ہیں، جو سنوسی رکھتے ہیں، خود سیدی احمد الشریف کے متعلق ان کے الفاظ ہیں:۔

وقد لحظت منه صبرا قل أن یوجد فی غیرہ من الرجال و عزما شدیدا تلوح سیماہ علی وجهه فبینما هو فی تقواہ من الأبدال اذا هو فی شجاعته من الأبطال۔

مجھے سید سنوسی میں غیر معمولی صبر و ثابت قدمی دکھائی دی جو کم لوگوں میں دیکھی، اولوالعزمی ان کے ناصیۂ اقبال سے ہویدا ہے، ایک طرف اپنے تقوی اور عبادت کے لحاظ سے اگر وہ اپنے زمانے کے ابدال میں شمار ہونے کے قابل ہیں تو دوسری طرف شجاعت کے لحاظ سے دلیران زمانہ کی صف میں شامل ہونے کے مستحق ہیں۔

امیر شکیب نے صحرائے اعظم افریقہ کی سنوسی خانقاہ کی جو تصویر کھینچی ہے، وہ بڑی دل آویز اور سبق آموز ہے، یہ خانقاہ "واحۃ الکفرہ" میں واقع تھی، اور سیدی احمد الشریف کے چچا اور شیخ السید المہدی کے انتظام میں تھی۔ اور افریقہ کا سب سے بڑا روحانی مرکز

اور جہاد کا دار التربیت تھی، امیر مرحوم لکھتے ہیں:۔

"سید مہدی صحابہ و تابعین کے نقش قدم پر تھے، وہ عبادت کے ساتھ بڑے عملی آدمی تھے، ان کو معلوم تھا کہ قرآنی احکام حکومت و اقتدار کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتے اس لئے وہ اپنے برادران طریقت اور مریدین کو ہمیشہ شہسواری، نشانہ بازی کی مشق کی تاکید کرتے رہتے، ان میں غیرت اور مستعدی کی روح پھونکتے، ان کو گھوڑ دوڑ اور سپہ گری کا شوق دلاتے رہتے، اور جہاد کی فضیلت و اہمیت کا نقش ان کے دل پر قائم کرتے، ان کی یہ کوششیں بار آور ہوئیں، اور مختلف مواقع پر اس کے اچھے نتائج برآمد ہوئے، خصوصاً جنگ طرابلس میں سنوسیوں نے ثابت کردیا کہ ان کے پاس ایسی مادی قوت ہے، جو بڑی بڑی حکومتوں کی طاقت سے ٹکر لے سکتی ہے، اور بڑی باجبروت سلطنتوں کا مقابلہ کر سکتی ہے، صرف جنگ طرابلس ہی میں سنوسیوں کا جوش و غضب ظاہر نہیں ہوا، بلکہ علاقہ کانم اور وادی (سوڈان) میں وہ سنہ ۱۳۱۹ھ سے سنہ ۱۳۳۲ھ تک فرانسیسیوں سے برسر جنگ رہے۔

سیدی احمد الشریف نے مجھے سنایا کہ ان کے چچا سید مہدی کے پاس پچاس پچاس ذاتی بندوقیں تھیں، جن کو وہ بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے ہاتھ سے صاف کرتے اور پوچھتے تھے، اگرچہ ان کے سیکڑوں کی تعداد میں مریدین تھے، مگر وہ اس کے روادار نہیں تھے کہ یہ کام کوئی اور کرے، تاکہ لوگ ان کی اقتدا کریں، اور جہاد کی اہمیت کو سمجھیں اور اس کے سامان و ذخائر کا اہتمام کریں، جمعہ کا دن جنگی مشقوں کے لئے مخصوص تھا، گھوڑوں کی ریس ہوتی، نشانہ کی مشق ہوتی وغیرہ وغیرہ، خود سید ایک بلند جگہ پر تشریف فرما ہوتے، شہسوار دو حصوں

(پارٹیوں) میں تقسیم ہو جاتے، اور دوڑ شروع ہوتی، یہ سلسلہ دن چھپنے تک جاری رہتا کبھی کبھی نشانہ مقرر ہوتا، اور نشانہ بازی شروع ہوتی، اس وقت علماء اور مریدین کا نمبر نشانہ بازی میں بڑھا ہوتا، کیونکہ ان کے شیخ کی ان کے لئے خاص تاکید تھی، جو لوگ گھوڑ دوڑ میں پالا جیت لیتے یا نشانہ بازی میں بازی لے جاتے، ان کو قیمتی انعامات ملتے، تاکہ جنگی کمالات کا شوق ہو، جمعرات کا دن دستکاری اور اپنے ہاتھ سے کام کرنے کے لئے مقرر تھا، اس دن اسباق بند ہو جاتے مختلف پیشوں اور صنعتوں میں لوگ مشغول ہوتے، کہیں تعمیر کا کام ہو رہا ہوتا، کہیں بخاری، کہیں لوہاری، کہیں پارچہ بافی، کہیں وراقی کا مشغلہ نظر آتا، اس دن جو شخص نظر آتا وہ اپنے ہاتھ سے کام کرتا دکھائی دیتا، خود سید مہدی بھی پورے مشغول رہتے، تاکہ لوگوں کو عمل کا شوق ہو، سید مہدی اور ان سے پہلے ان کے والد ماجد کو زراعت اور درخت لگانے کا بڑا اہتمام تھا، اس کا ثبوت ان کی خانقاہیں اور ان کے خانہ باغ ہیں، کوئی سنوسی خانقاہ ایسی نہیں ملے گی جس کے ساتھ ایک یا چند باغات نہ ہوں، وہ نئے نئے قسم کے درخت دور دراز مقامات سے اپنے شہروں میں منگواتے تھے، انھوں نے کفرہ اور جغبوب میں ایسی ایسی زراعتیں اور درخت روشناس کئے، جن کو وہاں کوئی جانتا بھی نہ تھا بعض طلباء سید محمد السنوسی (بانی سلسلۂ سنوسیہ) سے کیمیا سکھانے کی درخواست کرتے تھے، تو وہ فرماتے تھے کہ "کیمیا ہل کے نیچے ہے"، اور کبھی فرماتے "کیمیا کیا ہے، ہاتھ کی محنت اور پیشانی کا پسینہ" وہ طلباء اور مریدین کو پیشوں اور صنعتوں کا شوق دلاتے، اور ایسے جملے فرماتے جن سے ان کی ہمت افزائی ہوتی اور وہ اپنے پیشوں اور صنعتوں کو حقیر نہ سمجھتے، اور

نہ ان میں علماء کے مقابلہ میں احساس کمتری پیدا ہوتا، چنانچہ فرماتے تھے کہ بس تم کو حسن نیت اور فرائض کی پابندی کافی ہے، دوسرے تم سے افضل نہیں، کبھی کبھی اپنے کو بھی پیشہ وروں میں شامل کرکے، اور ان کے ساتھ کام میں شرکت کرتے ہوئے فرماتے: "کیا یہ کاغذوں والے (علماء) اور تسبیحوں والے (ذاکرین وصوفیہ) سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے یہاں سبقت لے جائیں گے، نہیں خدا کی قسم وہ ہم سے کبھی سبقت نہیں لے جاسکتے"[۱]

عالم اسلام پر سید جمال الدین افغانیؒ کی شخصیت و دعوت نے جو اثر ڈالا ہے وہ کسی صاحب نظر سے مخفی نہیں، بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ نئی دنیائے اسلام کے معماروں میں ہیں، سید جمال الدین افغانیؒ سرتاپا دعوت وعمل اور ایک شعلۂ جوالہ تھے، جس نے افغانستان سے لے کر ترکی تک تمام عالم اسلام میں حمیت اسلامی کی روح اور اتحاد اسلامی کا صور پھونکا، یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان کا سوز دروں اور اور گرمیٔ نفس میں اور ان کی بے چین طبیعت اور مسلسل جدوجہد میں ان کے ذکر قلبی اور باطنی بیداری کو بھی دخل ہے، جس کے بغیر اکثر آدمی مسلسل محنت اور مخالفتوں اور مایوس کن حالات کا ہمیشہ مقابلہ نہیں کرسکتا، یہی حال ان کے شاگرد رشید اور دست راست شیخ محمد عبدہ کا ہے، جو تصوف کے لذت آشنا اور اس کوچہ سے واقف تھے[۲]

معاصر دینی تحریکوں میں الاخوان المسلمون کی تحریک سب سے زیادہ طاقتور

---

[۱] حاضر العالم الاسلامی ج ۲ ص ۱۶۳-۱۶۴ [۲] مجھ سے قاہرہ میں مصر کے مشہور فاضل و مصنف ڈاکٹر احمد امین بے نے خود اس کا تذکرہ کیا، جنھوں نے ان کا زمانہ پایا تھا اور شیخ محمد عبدہ کے درس میں شریک ہوئے تھے۔

اور منظم تحریک ہے، اور عالم عربی کے لئے تو وہ احیائے دین اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی واحد تحریک ہے، اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا زندگی سے پورا ربط ہے، اور ممالک عربیہ کی عمومی زندگی پر اس نے بڑا گہرا اور محسوس اثر ڈالا ہے، اس کے بانی شیخ حسن البنا، مرحوم کی شخصیت بڑی مؤثر، دل آویز اور ہمہ گیر شخصیت تھی، وہ سر تا پا عمل اور مجسم جد و جہد تھے، نہ تھکنے والے، نہ مایوس ہونے والے، نہ پست ہونے والے سپاہی اور داعی تھے، ان کی ان خصوصیات میں ان کے روحانی نشو و نما اور سلوک کو بڑا دخل ہے، وہ جیسا کہ انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح میں تصریح کی ہے، طریقۂ حصافیہ شاذلیہ میں بیعت تھے، اور باقاعدہ اس کے اذکار و اشغال کی ورزش کی تھی[۱] ان کے خواص اور معتمدین نے بیان کیا کہ وہ زندگی کے آخری مصروف ترین دنوں میں بھی اپنے اوراد و معمولات کے پابند رہے، اخوان کی پانچویں مؤتمر ۱۳۵۷ھ میں انھوں نے اخوان کی تحریک کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی تعریف میں حسب ذیل جملے کہے تھے:۔

دعوۃ سلفیۃ وطریقۃ سنیۃ	ایک ایسی جماعت جس میں سلف کی
وحقیقۃ صوفیۃ وھیئۃ سیاسیۃ	دعوت، اہل سنت کا طریقہ، تصوف
وجماعۃ ریاضیۃ، رابطۃ علمیۃ،	کی حقیقت، سیاست، ورزش، علم و
ثقافیۃ وشرکۃ اقتصادیۃ	ثقافت، اقتصادی تعاون اور
وفکرۃ اجتماعیۃ۔	اجتماعی فکر جمع ہیں۔

ہندوستان میں تصوف و جہاد کا ایسا عجیب امتزاج و اجتماع ملتا ہے جس کی نظیر دور دور ملنی مشکل ہے، اس سلسلہ میں حضرت سید احمد شہیدؒ کا تذکرہ تفصیل حال

[۱] ملاحظہ ہو "مذکرات الدعوۃ والداعیۃ" جو خود ان کی تصنیف ہے۔

ہے کہ ان کی یہ جامعیت مسلمات میں سے ہے، اور حد تواتر کو پہونچ چکی ہے، ان کے رفقا، جہاد اور ان کے تربیت یافتہ اشخاص کے جوش جہاد، شوق شہادت، محبت دینی، بغض فی اللہ کے واقعات قرون اولی کی یاد تازہ کرتے ہیں، جب کبھی ان کے مفصل واقعات سامنے آئیں گے، تو اندازہ ہوگا کہ یہ قرن اول کا ایک بچا ہوا ایمانی جھونکا تھا، جو تیرھویں صدی میں چلا تھا، اور جس نے دکھا دیا تھا کہ ایمان، توحید اور صحیح تعلق باللہ اور راہ نبوت کی تربیت و سلوک میں کتنی قوت اور کیسی تاثیر ہے، اور بغیر صحیح روحانیت اور اصلاح کے پختہ جوش و جذبہ، اور ایثار و قربانی اور جاں سپاری کی امید غلط ہے۔

سید صاحب کے جانشینوں میں مولانا سید نصیر الدین اور مولانا ولایت علی عظیم آبادی، سید صاحبؒ کے پرتو تھے، ان کے جانشینوں میں مولانا یحیی علی اور مولانا احمد اللہ صادق پوری بھی دونوں حیثیتوں کے جامع تھے، ایک طرف ان کے جہاد و ابتلاء اور امتحان کے واقعات امام احمد بن حنبل کی یاد تازہ کرتے ہیں، اور وہ کبھی گھوڑے کی پیٹھ پر، کبھی انبالہ کے پھانسی گھر میں، کبھی جزیرۂ انڈمان میں محبوس نظر آتے ہیں، دوسرے وقت وہ سلسلۂ مجددیہ و سلسلۂ محمدیہ (سید صاحب کے خصوصی سلسلہ) میں لوگوں کی تربیت و تعلیم میں مشغول دکھائی دیتے ہیں [۱]

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

ہندوستان کی پوری اسلامی تاریخ کی مجاہدانہ جد و جہد اور قربانیاں اگر ایک پلڑے میں رکھی جائیں اور اہل صادق پور کی جد و جہد اور قربانیاں دوسرے

[۱] ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "جب ایمان کی بہار آئی"

پلڑے پر تو شاید یہی پلڑا بھاری رہے۔

ان حضرات کے بعد بھی ہم کو اہل سلسلہ اور اصحاب ارشاد دینی جدوجہد اور جہاد فی سبیل اللہ کے کام سے فارغ اور گوشہ گیر نہیں نظر آتے، شاملی کے میدان میں حضرت حاجی امداداللہ، حضرت حافظ ضامن، مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہم، انگریزوں کے خلاف صف آرا نظر آتے ہیں، حضرت حافظ ضامن وہیں شہید ہوتے ہیں، حاجی صاحب کو ہندوستان سے ہجرت کرنی پڑتی ہے، مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی کو عرصہ تک گوشہ نشین اور مستور رہنا پڑتا ہے۔

پھر مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ (جن کو ہندوستان کے مسلمانوں نے بجا طور پر شیخ الہند کے لقب سے یاد کیا) انگریزوں کے خلاف جہاد کی تیاری کرتے ہیں، اور ہندوستان کو ان کے وجود سے پاک کر کے ایک ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، جس میں مسلمانوں کا اقتدار اعلیٰ اور ان کے ہاتھ میں ملک کی زمام کار ہو، ان کی بلند ہمتی ان کو ترکی سے تعلقات قائم کرنے اور ہندوستان و افغانستان و ترکی کو ایک سلسلۂ جہاد میں منسلک کرنے پر آمادہ کرتی ہے، ریشمی خطوط اور انور پاشا کی ملاقات، مالٹہ کی اسارت ان کی عالی ہمتی اور قوت عمل کا ثبوت ہے۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝

ان مسلسل تاریخی شہادتوں کی موجودگی میں یہ کہنا کہاں تک صحیح ہوگا کہ تعطل و بے عملی حالات کے مقابلہ میں سپر اندازی اور پسپائی تصوف کے لوازم میں سے ہے، اگر اس دعوے کے ثبوت میں چند متصوفین اور اصحاب طریقت کی مثالیں ہیں،

تو اس کے خلاف بڑی تعداد میں ان ائمہ فن اور شیوخ طریقت کی مثالیں ہیں، جو اپنے مقام اور رسوخ فی الطریقہ میں بھی اول الذکر اصحاب سے بڑھے ہوئے ہیں۔

اگر تصوف اپنی صحیح روح اور سلوک راہ نبوت کے مطابق ہو، اور یقین و محبت پیدا ہونے کا باعث ہو (جو اس کے اہم ترین مقاصد و نتائج ہیں) تو اس سے قوت عمل، جذبۂ جہاد، عالی ہمتی، جفاکشی، اور شوق شہادت پیدا ہونا لازمی ہے، جب محبت الٰہی کا چشمہ دل سے ابلے گا، تو روئیں روئیں سے یہ صدا بلند ہوگی ؎

اے آنکہ ز نی دم از محبت　　از ہستی خویشتن پرہیز،
برخیز و بہ تیغ تیز بنشین　　یا از رہ راہ دوست برخیز

ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

علم حقیقی اور علم ظاہری کا فرق

مجھے آغاز جوانی ہی میں مولانا سید محمد علی مونگیری بانیٔ ندوۃ العلماء کے رسالہ "ارشاد رحمانی" کے مطالعہ کا اتفاق ہوا، انھوں نے اس کتاب میں بڑی سادگی اور خلوص و بے تکلفی کے ساتھ اپنے بعض مشائخ اور بزرگوں کا ذکر کیا ہے، خاص طور پر اپنے شیخ و مرشد مولانا شاہ فضل رحمانؒ گنج مراد آبادی سے اپنے تعارف اور ملاقات کا ذکر اس انداز میں کیا ہے، کہ پڑھنے والا بھی اس کے کیف سے محروم نہیں رہتا، اس ملاقات کا ذکر انہی کی زبان سے سنیئے:۔

"ایک مرتبہ حضرت قبلہ بنارس تشریف لئے جاتے تھے، اور حسب دستور کانپور میں فروکش ہوئے، مجھے اطلاع نہیں ملی مگر ایک اضطراب پیدا ہوا، میں بے اختیار کھڑا ہو گیا، اور مضطربانہ اِدھر اُدھر پھرنے لگا، اتفاقاً راہ میں حافظ موسیٰ صاحب دوست محمد عطر فروش کی دوکان پر ملے، اور انھوں نے حضرت قبلہ کے تشریف لانے کا حال بیان کیا، میں اسی وقت مطبع نظامی گیا، جمعہ کا روز تھا، خاں صاحب مالک مطبع نظامی تنہا بیٹھے ہوئے تھے، میں نے عرض کیا کہ میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا چاہتا ہوں،

آپ بہ نظر عنایت اطلاع کر دیجیۓ، خاں صاحب کوٹھے پر جہاں آپ رونق افروز تھے، گئے اور پھر آکر کہا کہ:۔ آج جمعہ کا دن ہے، اس وقت ملاقات نہیں ہوگی، بعد نماز جمعہ آنا، میں افسردہ ہو کر لوٹ آیا، اور جمعہ کی نماز کرنیل محمد زماں خاں کی مسجد میں پڑھی، اس کے بعد خاں صاحب کے ہمراہ خدمت بابرکت میں حاضر ہوا، مگر پہلے سے کچھ لوگ وہاں پہونچ گئے تھے، اور آپ انھیں کچھ کتابیں تقسیم فرما رہے تھے، تھوڑی دیر خاں صاحب اور میں کھڑے رہے، جس وقت آپ نے نظر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا اسی وقت لوگوں سے فرمایا اب جاؤ انھیں بیٹھنے دو، بعض نے بیٹھے رہنے پر اصرار کیا، مگر آپ نے فرمایا کہ نہیں اس وقت جاؤ، سب چلے گئے، میں اور خاں صاحب بیٹھ گئے، مجھ سے ارشاد فرمایا کہ تم کیا پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ "قاضی مبارک"، ارشاد ہوا استغفر اللہ نعوذ باللہ قاضی مبارک پڑھتے ہو، اس سے حاصل؟ ہم نے فرض کیا کہ تم منطق پڑھ کر قاضی مبارک کے مثل ہو گئے پھر کیا؟ قاضی مبارک کی قبر پر جا کر دیکھو کہ کیا حال ہے، اور ایک بے علم کی قبر پر جاؤ جس کو خدا سے نسبت تھی، اس پر کیسے انوار و برکات ہیں، فیضان صحبت سے مجھے اس وقت نیم بے خودی سی تھی، اس کے بعد کچھ خاں صاحب سے کلام کیا، اور پھر ارشاد فرمایا کہ کیا پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ "ھدایۃ" کیونکہ میں ان دنوں دونوں کتابیں پڑھتا تھا، اس پر بیع و شرا کے مسئلے دریافت فرمانے لگے، اس وقت میری حالت ایسی متغیر تھی، کہ جن مسائل کا میں بے تأمل جواب دے سکتا تھا، ان کا جواب بھی بہت تأمل سے دیا، اسی اثناء میں حضرت قبلہ نے عبدالرحمٰن خاں صاحب سے دریافت کیا کہ تم نے صبح آکر کہا تھا کہ ایک طالب علم ملنے کو آتے ہیں، وہ کون تھے؟ خانصاحب نے کہا کہ جناب یہی تھے، ارشاد ہوا کہ تم بڑے نادان ہو، مجھ سے آکر کہا کہ ایک طالب علم

آئے ہیں، بھلا میں کیا جانوں کون طالب علم ہے، یہ تو ہمارا لڑکا ہے، خاں صاحب نے جواب دیا حضرت مجھے نہیں معلوم تھا، غرضکہ عصر کے وقت تک خاں صاحب اور میں صحبت سے فیض یاب رہے، اس وقت تک اگرچہ شرفِ بیعت مجھے حاصل نہ تھا، مگر یہ عنایت مژدہ تھی حصولِ نیازمندی کا۔"

فیضانِ محبت

اس کے بعد انھوں نے اس کی تفصیل بیان کی کہ مولانا سے ان کی عقیدت و محبت کس طرح روز افزوں ہوتی گئی، چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ آگے چل کر انھوں نے مولانا شاہ فضل رحمانؒ کی نگاہ میں قرب و اختصاص کا وہ مقام حاصل کر لیا جو کسی اور کو حاصل نہ ہو سکا، انھوں نے اس مختصر رسالہ میں دنیا و اسباب دنیا سے شاہ صاحب کی بے تعلقی، اللہ تعالےٰ کی طرف رجوع تام، ان کی شان عبدیت اور افتقار الی اللہ کی کیفیت، اتباع سنت کا غایت درجہ اہتمام اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور اذکار و ادعیہ کی جستجو اور اس پر عمل کا ذکر کیا ہے، میں نے اپنے بچپن میں یہ کتاب پڑھی، اور میری عقل و شعور نے اس کے خوشگوار اثر کو پوری طرح قبول کیا، اور اس سے لذت یاب ہوا، ان عاشقانہ و عارفانہ اشعار نے بالخصوص مجھے بہت متاثر کیا جو مولانا کو بہت پسند تھے، اور وہ اکثر ان کو اپنی زبان گہربار سے ارشاد فرماتے تھے، ان اشعار سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ عشق و محبت کی ایک آگ مولانا کے سینے میں سلگ رہی ہے، اور وہ ان اشعار سے محبت کی اس آنچ کو ہلکا اور اپنی تسکین و تسلی کا کچھ سامان کرنا چاہتے ہیں، اور ان کا حال حضرت مرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ کے اس شعر کا مصداق ہے ؎

الٰہی درد دل کی سرزمیں کا حال کیا ہوتا
محبت گر ہماری چشم تر سے مینہ نہ برساتی

علم کا مقصد عمل ہے

اسی زمانہ میں والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ مطبوعہ اوراق میرے ہاتھ لگ گئے، جو ''استفادہ'' کے نام سے موسوم تھے، اس میں والد صاحب نے مولانا فضل رحمان رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں اپنی حاضری اور ملاقاتوں کی کہانی بڑے ذوق و شوق کے ساتھ سنائی ہے' اور بڑے دلکش انداز میں سنائی ہے' اس کہانی کے جستہ جستہ اقتباسات آپ بھی سنئے، اور مولانا کی سادگی اور للّٰہیت' اخلاص اور تعلق مع اللہ اور دردِ محبت کا اندازہ کیجئے۔

''میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا علم کی غرض عمل ہے، اگر عمل نہ ہوا تو علم حاصل کرنا بیکار ہے' اولیاء اللہ جتنا پڑھتے تھے' اس پر عمل کرتے تھے' فرمایا شاہ مینا شرح وقایہ پڑھتے تھے، جب کتاب الزکوٰۃ تک پہونچے، چھوڑ دیا، استاذ نے سمجھایا تو کہا کہ علم کی غرض عمل ہے، صوم وصلوٰۃ مجھ پر فرض ہے' اس کا علم حاصل کرنا ضروری تھا، زکوٰۃ مجھ پر فرض نہیں، جب کبھی فرض ہوگی تو اس کے مسائل بھی سیکھ لوں گا، اس وقت اس کا پڑھنا وقت کو ضائع کرنا ہے' یہاں تک پہونچ کر آپ پر کیفیت طاری ہوگئی، اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، اور آپ نے اشعار پڑھنے شروع کئے، ان میں ایک شعر یہ بھی تھا ؎

سرمہ در چشم سنائی چوں سنان تیر باد
گر زمانے زندگی خواہد سنائی بے سخن

یہ شعر بھی آپ نے پڑھا ؎

کجرا دیوں تو کرکرا سرمہ دیوں نہ جائے

جن نینن ما پیو بسیں دوجے کون سمائے

وہاں سے اٹھ کر ہم لوگ مسجد میں آئے، حیرت یہ ہے کہ تکانِ سفر سے کچھ بھی ماندگی نہ تھی، اس شب کو جس قدر نوافل میں نے پڑھیں اور جس ذوق و شوق سے پڑھیں کبھی نہ پڑھی تھیں، صبح کو جب رخصت ہونے کو گئے تو میرے ساتھی کو رخصت فرمادیا، جب میں آداب بجالایا تو فرمایا کہ ٹھہرو، وہیں مسجد میں جاکر ٹھہر گیا چاشت کے بعد آپ مسجد تشریف لائے، اور بیچ کے در میں بیٹھ گئے، حضرت احمد میاں صاحب مولوی عبدالکریم صاحب و حکیم عظمت حسین صاحب وغیرہ بخاری شریف لے کر حاضر ہوئے، میں بھی حلقہ درس میں شامل ہوگیا، آپ نے چھبیسویں پارے کے دو یا تین ورق پڑھے، باوجود کبر سنی کے چشمے کی مدد کی آپ کو حاجت نہیں ہوئی، شنجرف کی روشنائی اور کلک کا قلم رکھا ہوا تھا اس سے تصحیح فرماتے جاتے تھے، جو لطف آپ کے پڑھنے میں تھا، وہ قابل دید تھا نہ شنید، دوسروں پر انوار باطنی کا اس وقت انعکاس ہو رہا تھا، اور سب پر ایک کیفیت طاری تھی، بعد ظہر کے آپ پھر برآمد ہوئے اور دو ورق سے زیادہ آپ نے پڑھے، اور بعد عصر کے پھر آپ برآمد ہوئے، اور کئی ورق آپ نے پڑھے، اس روز آپ نے بہ ہیئت مجموعی ڈیڑھ پارہ پڑھا، لوگوں سے معلوم ہوا کہ آج غیر معمولی طور پر تین بار درس دیا ہے، ورنہ معمول ایک یا دو بار کا تھا، میں اس کو اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں۔

تیسری بار جب میں حاضر ہوا تو عصر کا وقت تھا، آپ صحن سے باہر حجرہ سے محاذی تشریف رکھتے تھے، نہایت لطف و محبت سے شرف پذیرائی عطا فرمایا، اور دیر تک

اپنے حالات بیان فرماتے رہے، اسی گفتگو میں آپ نے یہ شعر پڑھا ؎

دل ڈھونڈنا سینہ میں مرے بوالعجبی ہے
ایک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

سلسلۂ کلام کے ختم ہونے کے بعد میں نے عرض کیا کہ مجھکو حدیث مسلسل سنا دیجئے، آپ بہت محظوظ ہوئے اور فرمایا کہ میں نے اپنے کانوں سے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی زبان سے سنا ہے، پھر آپ نے تیمم فرمایا، ایک بار دست مبارک کو مٹی پر مار کر منھ پر پھیرا، اور پہونچوں تک ہاتھ میں مل لیا، اس کے بعد آپ نے یہ حدیث پڑھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ــــ "الراحمون یرحمھم الرحمان تبارک وتعالیٰ ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء" پھر آپ نے فرمایا میں تم کو حدیث مسلسل بالمحبۃ کی بھی اجازت دیتا ہوں، اس حدیث کو میں نے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے سنا ہے، "یا معاذ إنی أحبك فقل اللهم أعنی علی ذکرك وشکرك وحسن عبادتك"[1]

عارفین کی نگاہ میں متاع دنیا کی بے وقعتی

اس کے بعد ہی مجھے مولانا حبیب الرحمان خاں شروانیؒ کے سفرنامے کے مطالعہ کا موقع ملا جس میں انھوں نے مولانا کے ہاں اپنی حاضری کی سرگزشت بیان کی ہے، اور مولانا کی شخصیت و کمالات کا ایک اور رخ پیش کیا ہے، اس کے کچھ اقتباسات آپ کے سامنے ہیں۔

---

[1] استفادہ از مولانا سید عبدالحی مجموعہ رسائل تصوف از نواب نورالحسن خاں۔

"خیال تو یہ تھا کہ مراد آباد دنیا میں ہے، اور گاؤں نہیں قصبہ ہے، لیکن حضرت کی مسجد میں ایک دوسرا عالم نظر آتا تھا، دنیاوی معاملات کا کوسوں پتہ نہ تھا، خود حضرت کی گفتار و کردار، وہاں کے اہل قیام کے احوال سے (عام اس سے کہ وہ چند گھنٹے کے آئے ہوئے ہیں، یا دو چار برس سے رہتے ہیں) یہ معلوم ہوتا تھا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں، جو تعلقات دنیا سے کنارہ کر آئے ہیں، حیدر آباد کے امیر کبیر نواب خورشید جاہ بہادر جو ۴۰۲ لاکھ کے معافی دار ہیں، میرے پہونچنے سے صرف ایک روز پہلے وہاں آئے تھے، مگر ان کا ذکر بھی نہ تھا، اور نہ کوئی وقعت، ان کی کسی کے ذہن میں معلوم ہوتی تھی، حالانکہ کانپور اور بلہور ان کے تذکروں کی صدا سے گونج رہے تھے، اور ہر ایک سوسائٹی (خواہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ) ان کے تذکروں کو اپنے جلسوں کا دلچسپ مبحث بنائے ہوئے تھی، پھر یہ کس کا اثر تھا؟ آیا مراد آباد کے پانی کا؟ ہرگز نہیں، وہاں کی خاک کا؟ ہرگز نہیں، وہاں کے در و دیوار کا؟ ہرگز نہیں، حضرت کے ہاتھ پاؤں کا؟ ہرگز نہیں، حضرت کے بالوں کا؟ ہرگز نہیں، البتہ اس کیفیت کا اثر تھا، جو حضرت کے قلب میں تھی، وہ کیفیت کیا تھی، اس سے کون واقف ہے، اور کوئی کیا جانے مریض کا بدن بخار سے جلتا ہے، مگر وہ سوائے اثر کے مؤثر کو نہیں جانتا، سبب کو مشخص کرنا طبیب کا کام ہے، ہم بدن پر ہاتھ رکھ کر گرمی محسوس کر سکتے ہیں، مریض کو اپنا جسم گرم اور منھ کا مزا تلخ معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ جاننا کہ یہ غلبۂ صفرا کا نتیجہ ہے، طبیب کا کام ہے۔

دوسرا خیال یہ تھا کہ خود میرا ذہن مجھ کو ذلیل سمجھتا تھا، اور ہر چند حیرت سے غور کرتا تھا، لیکن کوئی وقعت اپنی میرے ذہن میں نہیں آتی تھی، دنیاوی جلسوں میں لفٹننٹ گورنر کے دربار دیکھے، رؤسا کے مجمع دیکھے، اہل علم کی مجلسیں دیکھیں، مگر کہیں

اپنے نفس کو اتنا بے حقیقت نہیں پایا، اپنے اعمالِ ذمیمہ ماضیہ پر خود نفس ملامت کرتا تھا، اور اپنی بے مائگی پر خود نفریں کن تھا، ہر شخص سے خواہ وہ کوئی ہو اپنے تئیں کم وقعت تصور کرتا تھا، غرض ایک عجیب خیال تھا کہ پورا بیان میں آنا مشکل ہے، وہاں سے آنے پر یہ خیال ایسے رہے، جیسے کہ کسی دلچسپ خواب کا صبح کو خیال اور لطف ہوتا ہے، رفتہ رفتہ یہ کیفیت زائل ہو گئی، اور چند لمحہ کے بعد پھر نفس امارہ "انا ولاغیری" اور "ہمچو ما دیگرے نیست" کے پھندے میں جا پھنسا، یہ خیال میرے نزدیک محض نئے اور نرالے تھے، جو مدت العمر میں کسی جگہ اور کبھی پیدا نہیں ہوئے، اس سے قیاس چاہتا ہے کہ وہ جگہ بھی کچھ اور جگہوں سے نرالی تھی" الخ بس باقی ہوس"۔

میں نے مولانا شیروانی سے اپنے شیخ و مرشد کے زہد و ورع، خودداری و بے نفسی، اخلاص و نورانیت، اور اہل دنیا کی تحقیر کا ذکر بھی بارہا سنا، اس کے علاوہ مولانا شاہ تجمل حسین بہاری، نواب سید نور الحسن خاں اور مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادیؒ کے دوسرے خلفا اور مسترشدین (جو اکثر ندوۃ العلماء کے رشتہ میں منسلک تھے) کی تحریروں اور رسالوں میں مولانا صاحب[1] کے حالات و کمالات پڑھنے کا موقع ملا، اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ تحریریں پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایمان میں محسوس طریقہ پر قوت پیدا ہو رہی ہے، اور مادیت کے پرستاروں کی حقارت اور دین کی عظمت دل نشین ہو رہی ہے۔

مولانا نے انگریز گورنر کا استقبال کس طرح کیا؟

جس اللہ کے بندے پر اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی منکشف ہو جاتی ہے، اور اہل دنیا اور ان کے مال و دولت سے وہ اپنی امید منقطع کر لیتا ہے، اور بے طمع ہو جاتا ہے

[1] مولانا کی زندگی میں اودھ میں مولانا کو اسی نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

اس کی نگاہ میں اہل حکومت اور اہل ثروت کی عظمت اور اس کے دل پر ان کا رعب نہیں رہتا، اور بعض اوقات بڑے بڑے اہل جاہ اور ارباب حکومت اس کو مور و مگس کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔

ابتدائے عہد انگریزی میں حاکم ضلع (کلکٹر) کی بھی جو حیثیت اور رعب و داب تھا، اس کو ابھی لوگ بھولے نہ ہوں گے، گورنر اور لفٹننٹ گورنر کی تو شان ہی اور تھی، لیکن اہل حقیقت اور اہل بصیرت کے یہاں ان خارجی و اضافی چیزوں (عہدوں اور حیثیتوں) کی کوئی اہمیت نہ تھی، اور وہ ان سے معمولی انسان کا سا سلوک کرتے تھے، مولانا کی خدمت میں دو مرتبہ صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کا لفٹننٹ گورنر حاضر ہوا، اور مولانا اس سے بے تکلفانہ بلکہ درویشانہ ملے، ایک حاضری کا حال مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں:۔

"ایک دفعہ لفٹننٹ گورنر نے مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ سے ملنے کی اجازت چاہی، آپ نے لوگوں سے فرمایا میں تو ایک فقیر آدمی ہوں، ان کے بیٹھنے کا کیا انتظام ہوگا، اچھا ایک کرسی منگا لینا، لفٹننٹ گورنر کی طرف سے تاریخ اور وقت بھی مقرر ہو گیا، اور آپ لوگوں سے یہ کہہ کر بھول بھی گئے، یہاں تک کہ لفٹننٹ گورنر مع چند حکام کے آموجود ہوئے، سب کھڑے تھے، ایک میم بھی کھڑی تھی، مولانا نے ایک الٹے گھڑے کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ بی تو اس پر بیٹھ جا[1]، لفٹننٹ گورنر نے کچھ تبرک مانگا آپ نے ایک خادم سے فرمایا، بھائی! دیکھو میری ہنڈیا میں کچھ ہو تو ان کو دے دو، اس میں کچھ چورا مٹھائی کا نکلا، بس سب کو تھوڑا تھوڑا تقسیم کر دیا،

---

[1] "افضال رحمانی" میں ہے کہ آپ نے ایک پیڑھی کی طرف اشارہ کیا جو پاس پڑی ہوئی تھی۔

سب نے ادب اور خوشی سے قبول کرلیا، اور تھوڑی دیر بیٹھ کر اجازت چاہی، اور رخصت ہوگئے، چلتے وقت نصیحت کی درخواست کی۔ فرمایا "ظلم مت کرنا"[1]

شرفاء و غرباء کی مدد کا انوکھا طریقہ

راقم سطور نے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم سے خود سنا کہ ایک بار سر شام کسی نے پانچ سو روپئے نذر کئے، اسی وقت اعلان فرما دیا کہ ہمارے حجرے کی دیوار گری جا رہی ہے، اس کی مرمت کی ضرورت ہے، اہل قصبہ اس ادا سے واقف تھے، بہت سے شرفاء اور غرباء ٹوکریاں اور پھاوڑے وغیرہ لے کر، حاضر ہوگئے، اور کسی نے دیوار کو ہاتھ لگایا، کسی نے کچھ کیا، آپ نے کسی کو کچھ دیا کسی کو کچھ، سونے سے پہلے پہلے ساری رقم تقسیم فرما کر فارغ ہوگئے، کسی صاحب نے عرض کیا آخر ایسی عجلت کیا تھی؟ فرمایا واہ! ہماری دیوار گری جا رہی تھی تم باتیں بناتے ہو۔

ان واقعات نے (جو دوسرے اہل حق اور اصحاب معرفت کے ساتھ بکثرت پیش آئے ہیں) مجھے بڑا فائدہ پہونچایا، ان کتابوں اور سفرناموں کا آغاز جوانی میں مطالعہ میرے لئے ایک بڑی سعادت اور خوش نصیبی تھی، اس کی وجہ سے کچھ نئے طرز اور نئی قطع کے انسانوں تک میری رسائی ہوئی، جو اس طرز سے بالکل مختلف تھا، جس کا مشاہدہ مجھے اپنے گرد و پیش میں اب تک ہوتا رہا تھا، وہ طرز زندگی جس میں مادیت کو بالادستی حاصل تھی، اور ملازمت حاصل کرنا اور کچھ روپیہ کما لینا انسان کا بڑا کمال سمجھا جاتا تھا، اور لوگوں کو جانچنے کا صرف ایک پیمانہ تھا، "آمدنی اور معیار زندگی کی بلندی"

---

[1] ارواح ثلٰثہ ص ۲۴۷-۲۴۶

اس ماحول میں مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی نے جو طرز اختیار کیا وہ اس شخص کا طرز تھا جو صرف ایمان ہی کے سہارے اور ایمان کی خاطر زندہ ہو، مادیت اور مادہ پرست اس کی نگاہ میں کوئی حیثیت نہ رکھتے ہوں، دین اور اہل دین کی اس کی نگاہ میں سب سے بڑی قیمت ہو، اور اپنے اخلاق و سیرت سے وہ اس "یقین" کی ایک جھلک پیش کر رہا ہو، جو صحابۂ کرامؓ اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں میں ہمیں نظر آتی ہے، اور جو اس "سوز دروں" اور "درد دل" کا ترجمان ہو جس میں زندگی کی حقیقی لذت اور ایمان کی حلاوت پوشیدہ ہے، اور جس سے احکام الٰہی کی کامل اطاعت، خواہشات نفس پر قابو، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور اتباع سنت خوشگوار اور آسان ہو جاتی ہے۔

اخلاقی تربیت اور تشکیل سیرت میں اہل دل کا حصہ

اس مطالعہ نے مجھے ایک اور لحاظ سے بھی فائدہ پہونچایا اس کے ذریعہ مجھے یہ اندازہ ہوا کہ ایمانی جذبات اور ایمانی ذوق ایک نسل سے دوسری نسل تک برابر منتقل ہوتا آرہا ہے، اور ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا رہا ہے، اور جس طرح اللہ تعالےٰ نے دین کے اصل حصار اور اس کے سرچشمہ کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، اسی طرح ایمانی خصوصیات، اذواق اور کیفیات کی حفاظت کا بھی ذمہ لیا ہے۔

اس مطالعہ سے مجھے ایمان و اخلاص کے ان اعلیٰ نمونوں کی عظمت و محبت نصیب ہوئی جس نے مجھے اِن اربابِ فضل و کمال سے غلط تأثر مرعوبیت اور ان کی حاشیہ نشینی اور درباداری سے محفوظ رکھا، جو علم کے لحاظ سے بہت بڑے تھے، لیکن حقیقی انسانیت سے عاری تھے، ان کی صورت و ظاہر بہت پر شکوہ تھا حقیقت اور

باطن اسی کے بقدر تہی مایہ..... ان کے اکثر کمالات ان کی سندوں اور ڈگریوں یا بڑی بڑی تنخواہوں، یا عظیم الشان بنگلوں اور محلوں یا تخت و تاج کے مرہون منت تھے، یا ان کا سایہ تھے، اگر یہ اضافی چیزیں ان سے تھوڑی دیر کے لئے سلب کر لی جائیں یا تو ان کا کاسہ بالکل خالی ہو جائے، اور شاید وہ مرنے سے پہلے مر جائیں، لیکن ایمان و اخلاص، صدق و تقویٰ، زہد و قناعت، خود شناسی و خودنگری اور استغنا و بے نیازی وہ صفات ہیں، جو ان کے حاملین و مخلصین و مقبولین بارگاہ سے کبھی چھینی نہیں جا سکتیں۔

ان کتابوں کے مطالعہ سے میرے اندر شوق پیدا ہوا کہ میں اس طرح کے اور لوگوں کو بھی تلاش کروں، اس تلاش و جستجو نے مجھے بالآخر کچھ ایسی ہستیوں تک پہونچایا جن کا میرے اس طرز زندگی میں بڑا دخل اور حصہ ہے، اور میری دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ تادم آخر مجھے اس پر قائم رکھے۔

أتاني هواها قبل أن أعرف الهوى

فصادف قلبا خاليا فتمكنا

اخلاص و محبت اور اخلاق و تربیت کا ایک مرکز

درونہا تیرہ شد باشد کہ از غیب　　چراغے برکند خلوت نشینے

نہ حافظ را حضور از ورد قرآں　　نہ دانشمند را علم الیقینے

زندگی اور مختلف طبقات کا وسیع مطالعہ و تجربہ

حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ[1] نے ایک ایسے دینی ماحول میں آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا جو زمانۂ حاضر کے اثرات اور جدید تعلیم کے خیالات سے دور تھا، مگر کبھی کسی روزن سے باہر کی آزاد خیالی کے جھونکے آجاتے تھے، اور ان کی سلیم لیکن حساس و ذہین طبیعت کی سطح پر تموج پیدا کر دیتے تھے، پھر حکمت الٰہی (جس کی مصلحتوں کو کوئی نہیں جانتا) آپ کو قادیان لے گئی جو اس وقت ایک ایسی نئی تحریک اور دعوت کا مرکز تھا، جو نئی بنیادوں پر ایک نئی ملت کی تاسیس کر رہی تھی، اور جس کو جمہور اہل اسلام اور سواد اعظم سے بنیادی اختلاف تھا، اور وہ ذہنی طور پر بے چین اور باغی عناصر کا ملجا و ماویٰ بنا ہوا تھا، وہاں انھوں نے اس تحریک کے بانی (مرزا صاحب) اور اس کے سب سے بڑے ترجمان اور وکیل (حکیم نورالدین صاحب) سے ملاقات کی

[1] وفات ۱۴ر اگست ۱۹۶۲ء در لاہور۔

اور اس نئی دینی ریاست اور پیشوائی کے اندرونی حالات دیکھے، پھر ہندوستان کے مختلف دینی و علمی مرکزوں اور مشہور درسگاہوں میں رہ کر علما کی حریفانہ کشمکش، جذبۂ رقابت، تکفیر و تفسیق کے مشغلے، اہل علم کا علمی پندار اور نخوت، اساتذہ کا معقولات میں توغل، مصلحین میں اپنی اصلاح، نفسانی امراض اور اخلاق رذیلہ کے علاج و استیصال سے غفلت کے مناظر اور نمونے دیکھے۔

اس دوران میں مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کی کئی تحریکیں پیدا ہوئیں، لیکن آندھی پانی کی طرح آئیں اور آندھی پانی کی طرح نکل گئیں، ان تحریکوں کے قائدین اور کارکنوں میں جذبات کی افسردگی، اخلاق کی پستی، تعلقات کی خرابی اور اپنی اصلاح نہ ہونے کے مفاسد اپنی آنکھوں سے دیکھے اور ان تحریکوں کے شاندار آغاز کے ساتھ ان کا حسرتناک انجام بھی مشاہدہ فرمایا۔

باہر کا انتشار اندر کے انتشار کا نتیجہ

رائے پور کے زمانۂ قیام میں تحریک خلافت کا عروج بھی دیکھا جو جدید ہندوستان کی سب سے عظیم، سب سے ہمہ گیر اور سب سے طاقتور (نیم دینی، نیم سیاسی تحریک تھی، اس تحریک کو نہ صرف قریب سے دیکھنے کا موقع ملا بلکہ اس کے رازہائے سربستہ اور اس کے منصوبوں سے واقفیت کا موقع بھی ملا، پھر حضرت نے (شیخ الہند کی وفات کے بعد) اس تحریک کا زوال، اس کے قائدین اور کارکنوں میں انتشار، مخصوص حضرات کو چھوڑ کر تحریک کے رہنماؤں میں اخلاص و تربیت کی کمی، رضاکاروں اور کارکنوں میں نظم و اطاعت کا فقدان، عوام میں اعتماد و انقیاد کی اور منتظمین و ذمہ داروں میں امانت و دیانت کی

کمی محسوس فرمائی اور اس کے شکوے سنے، اور آپ کی حقیقت رس طبیعت نے نتیجہ نکال لیا اور اس کو ذہن کے امانت خانہ میں محفوظ کرلیا کہ باہر کا انتشار اندر کے انتشار اور خلا کا نتیجہ ہے ؎

صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق
کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے

قلب کا خلا اور بگاڑ

آپ نے یہ بھی محسوس کرلیا کہ عوام میں انتشار و اضطراب قیادت کی کمزوری کی وجہ سے ہے، اور قیادت کی کمزوری، قائدین کی عدم تربیت اور سوز دروں کی کمی کی وجہ سے ہے، عوام کا قلب قائد ہیں، لیکن خود قائدین کا قلب اپنی جگہ سے ہٹا ہوا، اور ایمان و یقین اور عشق و سوز کے بجائے حب دنیا اور حب جاہ سے بھرا ہوا ہے۔

میرِ سپاہ ناسزا، لشکریاں شکستہ صف

اپنے وطن پنجاب میں مشائخ اور اہل خانقاہ کو دیکھا کہ انھوں نے بھی (الا ماشاء اللہ) متاع درد اور دوائے دل تقسیم کرنے کے بجائے اپنی مشیخت کی دکانیں سجا رکھی ہیں، اب وہاں بھی اصلاح و تربیت نفس اور اخلاص و للّٰہیت کی دولت ملنے کے بجائے نفس کو غذا اور عقل بہانہ جو کو دنیا طلبی کا حیلہ اور سند ملتی ہے۔

واعظین و مقررین کی شیوہ بیانی، اور فصاحت و بلاغت بھی سنی اور مصنفین اور اہل قلم کے ہاں معلومات کی فراوانی اور انشاپردازی کا زور بھی دیکھا، لیکن یہاں بھی اخلاص کی کمی، عمل کی کوتاہی، اور درد و سوز کے فقدان کی وجہ سے ان کے ذریعہ سے

عوام کی بہت کم اصلاح، اور انقلاب حال ہوتا دیکھا، چودہویں صدی کے وسط کا یہ زمانہ ہندوستان میں دینی خطابت کے انتہائی عروج و ترقی کا دور ہے، لیکن زندگی کا کاروانِ سست جس خواب گراں میں مدہوش یا جس غلط رخ پر رواں دواں تھا اس میں کوئی تغیر نہیں، کچھ عرصہ کی بات ہے کہ حضرت جگر مرادآبادی مرحوم نے حضرت کو اپنی ایک غزل سنائی، جب وہ غزل کے اس شعر تک پہونچے تو حضرت نے بڑی تحسین فرمائی، یہ ہندوستان کے واعظانہ حلقہ کی صحیح تصویر ہے ؎

واعظ کا ہر اک ارشاد بجا، تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں چہرے پہ یقیں کا نور نہیں

اخلاص کی کمی اور اخلاق کا فساد

مسلمانوں کے حالات کے اس وسیع مطالعہ اور اپنی زندگی کے اس طویل تجربہ نے آپ کو اس نتیجہ پر پہونچا دیا اور آپ کا یہ یقین اور عقیدہ بن گیا کہ مسلمانوں کی پوری زندگی اور اس کے مختلف شعبوں کے فساد کا اصل سبب اخلاص کی کمی اور اخلاق کا بگاڑ ہے، اور وقت کا سب سے بڑا ضروری کام اخلاص و اخلاق کا پیدا کرنا ہے، اور اس کا سب سے مؤثر ذریعہ محبت ہے، اور اس کا ذریعہ ذکر و صحبت ہے۔

اس اخلاص اور محبت سے ہر دینی کام اور ہر اصلاحی کوشش میں جان پڑتی ہے، اور وہ زندہ اور طاقتور بنتا ہے، اسی سے عبادات میں روحانیت علم میں نورانیت، اور تعلیم و تدریس میں برکت و قوت، وعظ و ارشاد میں تاثیر، تبلیغ

ودعوت میں قبولیت و قوت تصنیف و تالیف میں اثر و مقبولیت، سیاسی و تنظیمی کوششوں میں کامیابی و نتیجہ خیزی، تعلقات میں استواری، جماعتوں میں اتحاد، افراد میں ایثار و محبت پیدا ہوتی ہے، غرض پوری زندگی کی چول اپنی جگہ آجاتی ہے، اور ہر طرح کا ضعف و انتشار ختم ہو جاتا ہے، "ألا إنّ فی الجسد مضغة اذا اصلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله ألا وهی القلب"[1]

اسی طرح اخلاق کی درستگی کے بغیر کوئی انفرادی زندگی متوازن اور کامیاب، اور کوئی اجتماعی کوشش بار آور اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی، آپ کے نزدیک ذکر و شغل، صحبت مشائخ اور مجاہدات و ریاضات کا بڑا مقصد اور ثمرہ اخلاق کی اصلاح، صفات رذیلہ کا ازالہ، اور صحیح معنی میں تزکیۂ نفس ہے، محض ذکر اذکار کافی نہیں، اخلاق کی اصلاح ضروری ہے، ایک روز ایک صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے جو ایک موقع پر مغلوب الغضب ہو گئے تھے، فرمایا:—

"اصلاح کے لئے فقط ذکر کافی نہیں، اخلاق کی درستگی کرنی چاہیئے، اور مشائخ سے اخلاق ذمیمہ کا علاج کرانا چاہیئے، اسی واسطے زندہ مشائخ سے بیعت ہوتے ہیں کہ وہ اخلاق کی اصلاح کرتے ہیں، مثلاً غصہ ہے یہ بہت برا مرض ہے، حدیثوں میں اس کی بہت مذمت فرمائی گئی ہے، لیکن جب تک شیخ سے علاج نہیں ہوتا یہ مرض نہیں جاتا۔"[2]

---

[1] حدیث صحیح (ترجمہ) یاد رکھو انسان کے جسم میں ایک مضغۂ گوشت ہے، اگر وہ صحیح ہو جائے تو سارے جسم کا نظام صحیح ہو جاتا ہے، اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارے جسم کا نظام بگڑ جاتا ہے، وہ انسان کا دل ہے۔ (بخاری ج ۱)

[2] ملفوظات (قلمی) مرتبہ مولانا علی احمد صاحب مرحوم مجلس ۲۴ ر رمضان ۱۳۷۶ھ (۲۴ر اپریل ۱۹۵۷ء) بمقام لائل پور

لطائف ستہ کے انوار و آثار کا ذکر کرتے ہوئے ایک روز فرمایا۔

"ان لطائف کے جاری ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ قلب حرکت کرے یا انوار نظر آئیں بلکہ جاری ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ان کے علوم منکشف ہو جائیں، مثلاً قلب کا جاری ہونا یہ ہے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف خیال رہے، دل سے دنیا اور ہر چیز کی قیمت نکل جائے، اسی طرح لطیفۂ نفس جاری ہونے کے معنی یہ ہیں کہ رذائل وصفات رذیلہ نکل جائیں اور صفات حمیدہ پیدا ہو جائیں، اور انکساری و عاجزی پیدا ہو جائے، اپنے آپ کو سب سے حقیر سمجھیں، جب یہ حالت ہو تو سمجھے کہ کچھ چل پڑا ہے، اسی طرح دوسرے لطائف، اس میں انوار کا نظر آنا کوئی ضروری نہیں یہ تو محنت و ریاضت سے غیر مسلموں کو بھی حاصل ہو جاتے ہیں"[۱]

اخلاص و اخلاق کی جہانگیری اور کیمیا گری

حضرت کے سامنے سب سے پہلے صحابۂ کرامؓ کی زندگی اور ان کے کارنامے تھے، جن کے اخلاص و اخلاق کی بدولت اسلام نصف صدی کے اندر نصف دنیا میں پھیل گیا، اور ہر طرف خدا طلبی اور آخرت کوشی کی ہوا چل گئی حضرت نے ان کے حالات کا بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا، اور اپنی مجالس میں بار بار ان کے اخلاص و ایثار کے تذکرے فرماتے تھے۔

دور آخر میں آپ نے حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک اور ان کی جماعت کی

---

[۱] ملفوظات بتاریخ ۶ رجمادی الثانی ۱۳۷۶ھ (۸ رجنوری ۱۹۵۷ء) بمقام کوٹھی صوفی عبدالحمید صاحب، بیاض مولوی علی احمد صاحب مرحوم)۔

تاریخ کا بڑے ذوق و شوق سے مطالعہ فرمایا، فرماتے تھے کہ ان کے حالات پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس دور میں صحابۂ کرام کا نمونہ تھے، وہی رضائے الٰہی کی دھن، وہی شہادت کا شوق، وہی دنیا سے بے رغبتی، وہی ایثار و محبت اور قربانی کا جذبہ۔

پھر آپ نے اپنے شیخ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خادم حضرت خاں صاحب عبدالرحمان خاں[1] کی تبلیغ و صحبت کے اثرات دیکھے کہ کس طرح وہ دشمن کو

---

[1] خاں صاحب عبدالرحمان خاں تھانہ بھون کے رہنے والے تھے، استعداد نہایت عالی اور نسبت عشقیہ، جذبیہ تھی، ابتدا میں کرائے پر بیل گاڑی چلاتے تھے، ایک لطیفۂ غیبی اور ہادیٔ مطلق کی رہبری سے بیعت و سلوک کی طرف توجہ اور حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کی طرف نشاندہی ہوئی، بیعت ہوئے اور آثار و احوال غریبہ کا ورود ہوا، حضرت فرماتے تھے کہ پہلے مجھے خیال ہوتا تھا کہ شاید لوگوں نے پہلے بزرگوں کے حالات و کمالات لکھنے میں مبالغہ سے کام لیا ہے، لیکن جب میں نے میاں صاحب (عبدالرحمان خاں صاحب) سے ان کے حالات سنے اور اپنی آنکھوں سے دیکھے تو یقین ہوا کہ واقعی پرانے بزرگوں کے حالات بھی جو لوگوں نے لکھے ہیں درست ہوں گے، فرمایا کہ میں اور مولانا اللہ بخش صاحب اور میاں صاحب ایک مرتبہ ایک تقریب میں جمع تھے، وہاں ایک موقع پر ہم نے اصرار کیا کہ آپ اپنی بیعت کا واقعہ سنائیں، انھوں نے واقعہ سنانا شروع کیا، بیعت کا واقعہ سناتے سناتے رونا شروع کر دیا، ہم نے دیکھا کہ خون کے آنسو جاری ہیں، اور کرتا رنگین ہو رہا ہے، ہم بڑے گھبرائے، ہم نے خود کرتا دھویا، حضرت ان کی تاثیر و فیض صحبت کے واقعات اکثر سنایا کرتے تھے، برابر دورہ اور تبلیغ فرماتے، مدارس قائم کرتے اور حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کی خدمت میں وداد پیش کرتے، بڑے بڑے متکبر و فرعون طبیعت رئیسوں کی ان کی صحبت میں قلب ماہیت ہو جاتی تھی، فرماتے تھے جس روز ان کی وفات کی اطلاع رائے پور آئی ہے حضرت پر سارے دن عجیب اثر و کیف رہا، یہ بھی فرمایا کہ ہمیں امید تھی کہ اگر ایسے صاحب تاثیر اور قوی النسبت لوگ زندہ رہ جائیں تو مخلوق خدا کو بڑا فیض پہونچے اور اسلام کو ترقی ہو

دوست، پتھر کو موم، اور غافلوں اور فاسقوں کو تہجد گذار اور تقویٰ شعار بنا لیتے تھے، یہ سب ان کے اخلاص اور سوز دروں کا نتیجہ تھا، ان اہل دل بزرگوں اور دردمندوں کے واقعات بھی آپ کے سامنے تھے، جن کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ بجلی کا اثر اور جن کی صحبت کیمیا اور پارس کی تاثیر رکھتی تھی، پنجاب کے ایک باخدا عالم مولانا غلام رسول صاحب[1] کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

"بڑے عاشق تھے، ع "دلا غافل نہ ہو ایک دم" یہ انھیں کے اشعار ہیں، پنجابی تھے، ان کی اردو بھی ایسی ہی ہے، رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے عشق میں ان کے بڑے دردناک اشعار ہیں، صحبت میں یہ اثر تھا کہ جو ایک مرتبہ پاس بیٹھ جاتا ساری عمر اس کی تہجد بھی ناغہ نہ ہوتی، چہ جائیکہ فرض نماز، ہندوؤں میں جہاں وعظ کر دیتے سب کے سب مسلمان ہو جاتے، ایک دفعہ استنجے کے لئے ہاتھ میں ڈھیلا لئے کھڑے تھے، کچھ ہندو عورتیں قضائے حاجت کے لئے بستی کے باہر جنگل کو جا رہی تھیں، ڈھیلا زور سے زمین پر پھینکا اور فرمایا "إلا اللہ" وہ سب ہندو عورتیں "لا الہ الا اللہ۔ لا الہ الا اللہ" پڑھنے لگیں، اور گھر تک پڑھتی گئیں، اور مسلمان ہو گئیں، ایک شخص مسجد میں مکان کے اوپر سے کوڑا پھینک دیتا تھا، ایک دفعہ لوگوں نے مولانا سے کہا کہ فلاں شخص ہمیشہ مسجد میں مکان کے اوپر سے کوڑا پھینکتا

---

[1] قلعہ میہان سنگھ پنجاب کے رہنے والے تھے، بڑے عالم محدث اور صاحب تاثیر تھے، پہلے مولانا نظام الدین بگوی سے تعلیم حاصل کی، پھر دہلی آکر میاں سید نذیر حسین صاحبؒ کے درس حدیث میں شرکت کی، حضرت مولانا عبداللہ صاحب غزنوی رفیق درس تھے، وعظ و تذکیر میں ایسی تاثیر تھی کہ انگریزی حکومت نے وعظ کہنے اور بلا اجازت سفر کرنے کی ممانعت کر دی تھی، عامل بالحدیث اور صاحب تصنیف تھے ۱۲۹۱ھ میں وفات پائی (نزہۃ الخواطر ج ۸) و (تاریخ اہل حدیث از مولانا ابراہیم سیالکوٹی)

ہے، فرمایا کہ اب کی بار چھینکے تو مجھے دکھانا، دکھایا بھی، آپ نے فرمایا کب تک چھینکتا رہے گا؟ وہ وہیں سے نیچے کود پڑا اور تائب ہوا، جو ہندو یا عیسائی ایک دفعہ وعظ سن لیتا تھا مسلمان ہو جاتا تھا، اس واسطے انگریز نے زبان بندی کر دی تھی، اور وعظ سے روک دیا تھا۔[1]

اسی طرح کئی بار مولانا محمد صاحب فاروقی کے عشق و محبت اور درد و سوز اور ان کی تاثیر اور انقلاب انگیز صحبت کے واقعات بیان فرمائے، ایک مرتبہ فرمایا:۔

"مولانا عبداللہ صاحب کے والد مولانا محمد صاحب[2] بڑے عاشق تھے، بہت خوش الحان

---

[1] ملفوظات (قلمی) مرتبہ مولوی علی احمد صاحب مرحوم مجلس ۲۴ رجادی الثانی ۱۳۷۶ھ (۲۶ جنوری ۱۹۵۷ء) بمقام لاہور کوٹھی صوفی عبدالحمید صاحب۔

[2] مولانا محمد صاحب کوٹ بادل خاں ضلع جالندھر کے رہنے والے تھے، بڑے عالم تھے، حضرت مولانا مظہر صاحب نانوتوی بانی مظاہر العلوم سے تلمذ تھا، اور مولانا عبدالحق صاحب حقانی کے ہم سبق تھے، بڑی عاشقانہ اور درد مند طبیعت پائی تھی، ابتداء میں عشق مجازی میں گرفتار ہو گئے اور اس کی وجہ سے بڑی تکلیفیں برداشت کیں، پھر جاذبۂ توفیق الٰہی نے محبوب حقیقی کی طلب و عشق کی طرف متوجہ کیا، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہو گئے، حضرت نے ان کو ارشاد فرمایا تھا کہ آپ وعظ ہی کہتے پھریں، یہی آپ کا وظیفہ ہے، مولانا وعظ کے لئے دیوانہ وار پھرتے تھے، آواز میں اللہ تعالیٰ نے اتنی کشش دی تھی کہ جو بھی آپ سے وعظ یا کوئی شعر سن لیتا گرویدہ ہو جاتا، اکثر وعظ سننے والے تہجد گزار ہو جاتے، بڑے بڑے ڈاکو اور چور آپ کے ہاتھ پر تائب ہوئے۔

حضرت فرماتے تھے کہ جب ذکر کرنے بیٹھتے تو پہلے بڑے درد سے یہ شعر پڑھتے اور دل کھینچ لیتے ؎

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب	ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

(باقی ص ۱۴۷ پر)

تھے، ایک بستی میں تشریف لے گئے، لوگ باہر درختوں کے نیچے اکٹھے تھے، وارث شاہ کی ہیر[1] الجھا ہو رہی تھی، خادم سے کہا آؤ وہاں چلیں، ان سے کہا کہ لاؤ ہم ہیر سنائیں، ایسا پڑھا کہ دل کو کھینچ لیا، لوگوں نے کہا کہ واہ مولوی صاحب، پھر ہیر کو چھوڑ کر قرآن شریف پڑھ کر وعظ شروع کر دیا، سب بستی کی بستی مرید ہو گئی۔"

فرماتے تھے کہ اب یوں جی چاہتا ہے کہ ایک "لوا الحمد" بناؤں ایک اونٹ پر سوار ہوں اور قرآن پڑھ کر وعظ سناؤں، اور لوگ پتھراؤ کریں بس اس کا ذوق آرہا ہے[2]۔

اسی طرح ایک دوسرے صاحب اخلاص و درد عالم مولانا احمد الدین[3] کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"جس بستی سے گذر جاتے لوگ ایسا چمٹتے کہ پندرہ پندرہ روز تک جانے نہ دیتے ایک دفعہ گنگوہ شریف گئے، حالانکہ وہاں سب پیرزادے تھے، ایسے چمٹے کہ پندرہ دن تک آنے نہیں دیا، پھر بڑی مشکل سے وہاں سے نکلے اور ان لوگوں نے رو رو کر رخصت کیا۔

(باقی صـ۱۴۶ کا) پھر تھوڑا ذکر کرتے، پھر یہ شعر پڑھتے اور خوب روتے۔

مولانا مفتی فقیر اللہ صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ ضلع لاہور میں میرا گزر ایک جھونپڑے کے پاس ہوا جو بالکل جنگل میں تھا، سنتا ہوں کہ کوئی عورت جھونپڑے کے اندر بیٹھی ذکر بالجہر کر رہی ہے، مگر کچھ زیادہ جہر سے نہیں، میں وہاں ٹھہر گیا، پوچھا کہ آپ لوگوں کو کس کی صحبت سے یہ بات حاصل ہوگئی، انھوں نے کہا کہ یہاں سے ایک بزرگ سفید ریش گذرے تھے، ان کا نام محمد تھا، ہم ان سے بیعت ہو گئے، ہماری مستورات بھی ذاکرہ اور تہجد گزار ہیں، حلال و حرام پہچانتی ہیں، میں سمجھ گیا کہ یہ میرے استاد حضرت مولانا محمد صاحب فاروقی ہیں بـ۱۳۲۰ھ (۱۹۰۲ء) میں وفات پائی۔

[1] پنجاب کی مشہور عاشقانہ و عارفانہ مثنوی۔ [2] ملفوظات قلمی مجلس ۱۴؍ جمادی الثانیہ ۱۳۷۶ھ (۲۶ جنوری ۱۹۵۷ء) بمقام لاہور کوٹھی صوفی عبد الحمید صاحب۔) [3] حضرت کے رفیق درس مولانا فضل احمد صاحب کے بھتیجے، نہایت صاحب استعداد اور صاحب صلاح تھے، جوانی میں انتقال ہو گیا۔

ایک دفعہ دیوبند میں ایک بڑا جلسہ ہوا، بڑے بڑے علماء کرام وہاں موجود تھے، مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے ان کو کھڑا کر دیا، میں نے کہا جی یہ بیچارے ایسے بڑے علماء حضرات کے سامنے کیا کہیں گے؟ مولانا نے فرمایا کہ بعض بندے ایسے ہوتے ہیں کہ معمولی سے معلوم ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان سے بڑے کام لیتے ہیں، چنانچہ تین گھنٹے تک تقریر کی اور بڑا اثر ہوا۔[1]"

حضرت تمام کامیاب اور انقلاب انگیز دینی تحریکوں اور اصلاحی کوششوں کو ان کے داعیوں اور قائدین کے اخلاص، عشق و محبت اور درد و سوز کا نتیجہ سمجھتے تھے، "ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد" چنانچہ مرکز نظام الدین دہلی کی، عالمگیر دینی دعوت اور اس کے محیر العقول اثرات و نتائج کو اس کے داعی حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جن کے اخلاص و مقبولیت عند اللہ کے حضرت بے حد معتقد تھے) کی اندرونی کیفیات جذب دل، سوز و دردمندی اور اخلاص و للّٰہیت کا نتیجہ سمجھتے تھے۔[2]

جماعت کا وجود افراد پر اور اجتماعی اصلاح انفرادی اصلاح پر موقوف ہے

حضرت کی نظر سے یہ بات مخفی نہ تھی کہ سب ایسے صاحب تاثیر اور صاحب نسبت نہیں ہو سکتے، جیسے یہ حضرات تھے، اور نہ دین کی خدمت اور وعظ و ارشاد کا فریضہ ان غیر اختیاری

---

[1] ملفوظات قلمی مجلس ۲۴ رجمادی الثانیہ ۱۳۷۶ھ (۲۶ جنوری ۱۹۵۶ء)

[2] قائد کا اخلاص جب انتہائی مدارج پر پہونچ جاتا ہے تو وہ اپنے رفقاء اور پیرووں کی کثیر تعداد میں اخلاص و جذبۂ عمل اور عشق کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے، جیسا کہ تبلیغی تحریک میں دیکھا جا رہا ہے، مگر پھر بھی حصول اخلاص و احسان کے لئے ذاتی جد و جہد کی ضرورت رہتی ہے۔

کیفیات پر منحصر ہے، مگر آپ کا یہ خیال ضرور تھا کہ جماعت کا وجود افراد پر اور اجتماعی اصلاح کا انفرادی اصلاح پر موقوف ہے، اور مصلح سے پہلے صالح بننا ضروری ہے۔

مخلص کے لئے خدا کی توفیق

نیز اس بات پر آپ کو بڑا وثوق تھا اور بکرات ومرات یہ بات فرمائی کہ انسان کو اخلاص وہمت کے ساتھ، اپنی اصلاح اور ذکر الٰہی میں مشغول ہو جانا چاہیئے، اور اپنی طرف سے اپنے لئے کچھ تجویز نہیں کرنا چاہیئے، مربی مطلق اور مرشد حقیقی اس کے لئے جس کام کو مناسب سمجھے گا اس کام پر اس کو لگا دے گا، اور اس کی طرف اس کی طبیعت میں میلان قوی اور اس کے ساتھ مناسبت تامہ پیدا کر دے گا، اور پھر اس کام میں اس کی مدد فرمائے گا۔

کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند

ایک بار اسی طرح کا سوال کیا گیا تو اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:۔

"میرے خیال میں اصل مقصود تو ہر شخص کو اپنے نفس کی اصلاح ہے، فرائض وواجبات وعبادات ادا کرتا رہے، اور اللہ اللہ کرتا رہے، اگر اللہ تعالیٰ کو اس سے کوئی کام لینا مقصود ہوتا ہے، تو خود اس کی طبیعت کو اس طرف متوجہ کر دیتے ہیں، اور بطریق الہام یا بحکم شیخ اس کے کوئی کام سپرد کر دیا جاتا ہے، اس وقت اس کے لئے بہتر یہی ہوتا ہے کہ جو کام اس کے ذمہ لگایا گیا ہے، اس کو انجام دے، اور جب تک یہ نہ ہو اس وقت تک انفرادی طور پر اللہ اللہ کرتے رہنا اور عبادات ادا کرتے رہنا ہی اس کے لئے بہتر ہے اسی سے انشاء اللہ اس کی نجات ہو جائے گی۔

فرمایا دیکھو سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم حالانکہ ازکے النفس ہیں مگر آپ کو بھی

جب تک مامور من اللہ نہیں کیا گیا آپ غار حرا میں تشریف لے جا کر انفرادی طور پر اللہ کی عبادت ہی کرتے رہتے تھے، حالانکہ قوم کی بے اعتدالیاں، بت پرستی، ظلم اور تعدیاں، بہت دیکھتے رہتے تھے، مگر کسی سے تعرض نہیں کیا، اور غاروں میں اکیلے جا کر خدا کی یاد میں لگے رہتے تھے، لیکن آخر جب فرشتہ نازل ہوا اور فرمایا "بلغ ما انزل الیک" تو آپ غار حرا کو چھوڑ کر کمر باندھ کر کھڑے ہو گئے، اور اس فرض کو ادا کیا۔

بہرحال دیگر حضرات کا جو خیال بھی ہو میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہتا، میرا تو یہی خیال ہے کہ پہلے انفرادی طور پر اپنی اصلاح کرنی چاہئے، اور اپنی ہی فکر کرنی چاہئے اللہ تعالیٰ کو اگر اس سے کوئی کام لینا منظور ہوگا تو خود اس کو اس کی طرف متوجہ کر دیں گے، پھر اس کے لئے وہی بہتر ہے، اور تبلیغ میں بھی اپنی اصلاح مقصود ہونی چاہئے۔

ایک دفعہ ذکر کی ترقی اور ذکر کی استقامت کا ذکر کرتے ہوئے اسی مضمون کو دوسرے عنوان سے ارشاد فرمایا۔

"پوچھا گیا کہ ذکر کی آخر کوئی انتہا بھی ہے؟ فرمایا یہاں تک ذکر کرے کہ روح ذاکر ہو جائے، پوچھا گیا کہ روح کے ذاکر ہونے کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا کہ دھیان ہر وقت اسی کی طرف لگا رہے، خواہ دنیا کے کام کر رہا ہو، تجارت کرتا ہو کھیتی کرتا ہو، مگر خیال ہر وقت اسی طرف رہے، جیسا کہ کسی کو سر کا درد یا پیٹ کا درد ہو تو اگرچہ باتیں بھی کرتا رہتا ہے کام بھی کرتا رہتا ہے، لیکن خیال درد کی طرف رہتا ہے۔

پوچھا گیا کہ استقامت کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا کہ اس قدر پختگی حاصل ہو جائے کہ جب تک ذکر پورا نہ کرے، سکون نہ ہو، بے چینی و بے قراری سی رہے، اور جب

ذکر پورا کرے تو سکون و اطمینان حاصل ہو جائے، طبیعت میں فرحت و سرور محسوس ہو،
فرمایا جب اس درجہ پر پہونچ جائے تو اس کا تمام وجود ہی تبلیغ بن جاتا ہے اور اس سے
پہلے مجاہدہ ہوتا ہے، فرمایا یہاں پہونچ کر اللہ تعالیٰ کو اس سے جو کام لینا ہوتا ہے،
اس کی طرف اس کو متوجہ کر دیتے ہیں، تبلیغ یا تدریس یا تصنیف جس کام کی طرف
اس کی طبیعت کا رجحان ہوتا ہے، وہی خدمت اس سے لیتے ہیں، بعض اوقات الہام
کے ذریعہ سے حکم دیا جاتا ہے، بعض اوقات شیخ حکم دیتا ہے، اور کبھی خود بخود طبیعت
متوجہ ہو جاتی ہے۔"[1]

اس اصلاح باطن اور اخلاص کی دولت کے حصول کے بعد اس کی دینی خدمتوں اور دینی و علمی اشغال کا عالم دوسرا ہوتا ہے، خود امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا اظہار فرمایا ہے کہ حصول یقین و اخلاص کے بعد کے اور اس کے پیشتر کے مشاغل و خدمات میں زمین و آسمان کا فرق تھا، پہلے وہ کام تقاضائے نفس یا ضابطہ کی تکمیل کے لئے کرتے تھے، اب حکم الٰہی سے۔[2]

اجتماعی و متعدی کام کی اہلیت و صلاحیت

حضرت کا مقصود دینی مشاغل و خدمات سے چھڑانا اور اجتماعی زندگی اور جد و جہد سے نکال کر مستقل طور پر انفرادی اصلاح اور خلوت و عزلت میں بٹھانا نہیں تھا، آپ کا مقصود عوام میں ان کے درجہ کا اخلاص، تعلق باللہ اور شریعت کی پابندی پیدا کرنا اور خواص (علماء و مدرسین، مقررین، اہل قلم، اہل سیاست) میں ان کے درجے،

---

[1] ملفوظات قلمی ملفوظ ۱۲ رمضان المبارک ۱۳۷۳ھ (۲۴ رمئی ۱۹۵۴ء) بمقام گھوڑا گلی، کوہ مری۔

[2] ملاحظہ ہو "المنقذ من الضلال" ص ۱۵۳-۱۵۴ طبع دمشق۔

ان کے کام کی نزاکت و وسعت اوران کے ابتلا اور فتنوں کے مواقع کے بقدر ان میں اخلاص تعلق مع اللہ اور ایمان واحتساب وتصحیح نیت کا ملکہ پیدا کرنا تھا، آپ خوب سمجھتے تھے کہ درد واخلاص کے بعد ان کے علم وذہن کے جوہر اور زیادہ کھلیں گے، اور ان کی تھوڑی کوششیں کہیں زیادہ بار آور ہوں گی۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

قلوب ونفوس کی تربیت کا ایک مرکز

جیسا کہ آپ کا ارشاد گزر چکا ہے، اخلاص کے ساتھ مدت تک اللہ کا نام لینے اس کے راستے میں اپنی ہستی کو فنا کرنے اور ایک صادق ومخلص بندہ کے ساتھ وابستہ رہنے، اور اس کی اطاعت وانقیاد وخدمت کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے وقت کی ایک اہم ترین خدمت آپ کے سپرد فرمائی، اور بظاہر ایک گوشہ میں بٹھا کر قلوب ونفوس کی تربیت، حصول اخلاص واصلاح اخلاق کی دعوت اور معرفت ویقین اور عشق ومحبت کی دولت کو عام کرنے کا کام سپرد کیا کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے، اور درد وخلوص والوں سے درد وخلوص ملتا ہے۔

اخلاصِ عمل مانگ نیاگانِ کہن سے
شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کا دم واپسیں

حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی اوران کے کمالات و مقامات کے متعلق جو کچھ ان کے معاصر تذکرہ نویسوں نے آنے والی نسلوں کے لئے قلمبند کیا وہ اگرچہ خود بہت ناکافی اور تشنۂ تفصیل ہے، اوران متفرق اور منتشر حالات سے ان کی عظمت کا صحیح تصور نہیں ہوسکتا، لیکن یہ حالات بھی خدانخواستہ اگر مفقود ہوجاتے اور صرف ان کی وفات کا حال جو ان کے خلیفۂ خاص اور واقعہ کے شاہد عینی شیخ زین بدر عربی نے تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا ہے، محفوظ رہ جاتا تو ان کی عظمت اور مرتبت کا اندازہ کرنے کے لئے کافی تھا، تاریخ اسلام میں متعدد اکابر و ائمہ کی وفات کا واقعہ اور دنیا سے رخصت ہونے اور موت کے استقبال کی کیفیت کا حال اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اس سے نہ صرف ان حضرات کی عظمت، تعلق مع اللہ اور ایمان و یقین کا اندازہ ہوتا ہے، بلکہ اس سے اسلام کی صداقت بھی عیاں ہوتی ہے کسی امت کے اکابر اور کسی مذہب کے پیشواؤں کی آخری زندگی کے واقعات اوران کے دم واپسیں کے حالات، اس قدر مؤثر یقین افروز، ولولہ انگیز تاریخ میں نظر سے نہیں گذرے، جیسے مستند تاریخ نے ان اکابر اسلام کے محفوظ کئے ہیں۔

حضرت مخدوم منیری کی وفات کے جو حالات یہاں نقل کئے جاتے ہیں، ان سے ان کی بے نظیر استقامت، جذبۂ اتباع شریعت، امت محمدیہ کی فکر، اس کے لئے دلسوزی، اہل اسلام سے محبت اور ان کی خیر خواہی اور زندگی کی نازک ترین ساعت میں بھی ان کا خیال اور ان کے لئے دعا، اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید اور یقین و اعتماد کے ساتھ اس کی بے نیازی اور کبریائی کا ڈر، سلامتی، ایمان و حسن عاقبت کی فکر اور اہتمام بھی ظاہر ہوتا ہے۔

ابن یمین نے جس طرح سے دنیا سے جانے اور جس حضوری و مشاہدہ اور مسرت و تبسم کے ساتھ محبوب حقیقی کے پیام و قاصد کا استقبال کرنے کا نقشہ کھینچا تھا، وہ حضرت مخدوم کے وقت وفات کی سچی تصویر ہے ؎

منگر کہ دل ابن یمین پر خوں شد — بنگر کہ ازیں سرائے فانی چوں شد
مصحف بکف و پا بره و دیده بدوست — با پیک اجل خنده زناں بیروں شد

شیخ زین بدر عربی فرماتے ہیں:۔

چہار شنبہ کا دن تھا، اور ۵ شوال ۷۸۲ھ کی تاریخ میں حاضر خدمت ہوا، نماز فجر کے بعد اس نئے حجرہ میں جس کو ملک الشرق نظام الدین خواجہ ملک نے تعمیر کیا تھا سجادہ پر تکیہ سے سہارا لگائے بیٹھے تھے، شیخ جلیل الدین حقیقی بھائی اور خادم خاص اور بعض دوسرے احباب اور خادم جو متواتر کئی راتوں سے آپ کی خدمت کے لئے جاگتے رہے تھے، جن میں قاضی شمس الدین، مولانا شہاب الدین (جو خواجہ بینا کے بھانجے تھے) مولانا ابراہیم، مولانا آموں، قاضی میاں، ہلال و عقیق اور دوسرے عزیز حاضر تھے، آپ نے زبان مبارک سے فرمایا:۔

"لاحول ولا قوۃ إلا باللہ العلی العظیم" پھر حاضرین کی طرف رخ کر کے فرمایا۔

"تم بھی کہو" لوگوں نے تعمیل ارشاد کی، اور سب نے "لاحول ولا قوۃ إلا باللہ العلی العظیم" پڑھا اور پھر آپ نے مسکراتے ہوئے تعجب کے طور پر فرمایا۔ "سبحان اللہ اوہ ملعون اس وقت بھی مسئلہ توحید میں لغزش دینا چاہتا ہے، خدا کا فضل و کرم ہے اس کی طرف توجہ کیا ہو سکتی ہے؟" پھر آپ نے "لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم" پڑھنا شروع کیا، اور حاضرین سے بھی فرمایا تم بھی پڑھو، اس کے بعد آپ اپنے ادعیہ اور وظائف میں مشغول ہو گئے، چاشت کے وقت ان سے فارغ ہوئے کچھ دیر کے بعد اللہ تعالٰی کی حمد و ثنا میں مشغول ہوئے باآواز بلند "الحمد للہ" کہنے لگے، فرماتے تھے "خدا نے کرم فرمایا، المنۃ للہ المنۃ للہ" کئی بار دل کی خوشی اور اندرونی فرحت کے ساتھ اسی کو بار بار دہراتے رہے، فرماتے جاتے تھے "الحمد للہ الحمد للہ، المنۃ للہ، المنۃ للہ"۔

بعد ازاں مخدوم حجرہ سے صحن حجرہ میں تشریف لائے، اور تکیہ کا سہارا لیا تھوڑی دیر کے بعد دست مبارک پھیلائے، جیسے مصافحہ فرمانا چاہتے ہوں، آپ نے قاضی شمس الدین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور دیر تک لئے رہے، پھر ان کا ہاتھ چھوڑ دیا، خدام کو رخصت کرنے کا آغاز انھیں سے ہوا، پھر قاضی زاہد کا ہاتھ پکڑ کر سینۂ مبارک پر رکھا اور فرمایا ہم وہی ہیں، ہم وہی ہیں، پھر فرمایا، ہم وہی دیوانے ہیں، ہم وہی دیوانے ہیں، پھر تواضع اور خاکساری کی خاص کیفیت طاری ہو گئی، اور فرمایا "نہیں بلکہ ہم ان دیوانوں کی جوتیوں کی خاک ہیں" پھر حاضرین میں سے ہر ایک کی طرف اشارہ فرمایا، اور ہر ایک کے ہاتھ داڑھی کو بوسہ دیا، اور اللہ تعالٰی کی رحمت و مغفرت کے امیدوار رہنے کی تاکید فرمائی، اور بلند آواز سے پڑھا "لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا۔" پھر یہ شعر پڑھا

خدایا رحمت دریائے عام است

از آنجا قطرۂ برما تمام است

اس کے بعد حاضرین کی طرف رخ کر کے فرمایا: کل تم سے سوال کریں تو کہنا "لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ" لائے ہیں، اگر مجھ سے پوچھیں گے تو میں بھی یہی کہوں گا" اس کے بعد کلمۂ شہادت بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا "أشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له وأشهد أن محمداً عبده ورسوله" یہ الفاظ بھی ادا کئے "رضيت بالله رباً وبالإسلام ديناً وبمحمد رسولاً وبالقرآن إماماً وبالكعبة قبلة وبالمؤمنين إخواناً وبالجنة ثواباً وبالنار عذاباً (میں اللہ کو رب مانتا ہوں، اسلام کو دین، محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو نبی، قرآن کو اپنا پیشوا، کعبہ کو قبلہ، اہل ایمان کو اپنا بھائی، جنت کو اللہ کا انعام اور دوزخ کو اللہ تعالےٰ کا عذاب تسلیم کرتا ہوں، اور اس عقیدہ پر مطمئن ہوں۔)

اس کے بعد آپ نے مولانا تقی الدین اودھی کی طرف متوجہ ہو کر اپنا ہاتھ پھیلایا اور فرمایا: "عاقبت بخیر ہو" اور ان کے حال پر بڑی مہربانی اور عنایت فرمائی، اور پھر زبان مبارک سے فرمایا: "آموں" مولانا آموں حجرہ کے اندر تھے، وہ سن کر لبیک کہتے ہوئے دوڑتے ہوئے آئے، آپ نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا، اور چہرۂ مبارک پر ملنے لگے، فرمایا "تم نے بڑی خدمت کی، تمہیں نہیں چھوڑوں گا، خاطر جمع رکھو ایک ہی جگہ رہیں گے، اگر قیامت کے دن پوچھیں گے کہ کیا لائے؟ تو کہنا "لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا" اگر مجھ سے پوچھیں گے تو میں بھی یہی کہوں گا، دوستوں سے کہو خاطر جمع رکھیں اگر میری آبرو رہے گی تو میں کسی کو نہ چھوڑوں گا" اس کے بعد ہلال اور عقیق کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "تم نے ہم کو بہت خوش رکھا، ہماری بڑی خدمت کی، جیسے ہم تم سے خوش رہے ہیں،

تم بھی خوش ہو گے، اور ہمیشہ خوش رہو گے" تین مرتبہ اپنا ہاتھ میاں ہلال کی پیٹھ پر رکھا اور فرمایا بامراد رہو گے، اس وقت آپ کے دونوں پاؤں میاں ہلال کی گود میں تھے، اور ان کے حال پر بڑی عنایت تھی۔

اس عرصہ میں مولانا شہاب الدین ناگوری آئے آپ نے کئی بار ان کے سر، چہرہ داڑھی اور دستار کو بوسہ دیا، آپ آہ آہ کرتے جاتے تھے، اور "الحمد للہ الحمد للہ" کہتے جاتے تھے آپ نے ہاتھ نیچے کر لیا، اور درود پڑھنے لگے، مولانا شہاب الدین کی بھی آپ کے چہرۂ مبارک پر نگاہ تھی، اور درود پڑھ رہے تھے، اس کے بعد آپ نے مولانا شہاب الدین خواجہ زادہ خواجہ معین کا نام لیا، اور فرمایا "میری بڑی خدمت کی مجھ سے بہت اتحاد تھا، بڑی خوبی کے ساتھ میری صحبت اٹھائی، عاقبت بخیر ہو" اس وقت مولانا شہاب الدین نے مولانا مظفر بلخی، اور مولانا نصیر الدین جونپوری کا نام لیا، اور فرمایا کہ ان دونوں کے بارے میں کیا ارشاد ہوتا ہے؟ آپ نے بہت خوش ہو کر مسکراتے ہوئے، اور اپنی تمام انگلیوں سے سینۂ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا، "مظفر میری جان ہے، میرا محبوب ہے، مولانا نصیر الدین بھی اسی طرح ہیں خلافت اور مقتدائی کے لئے جو شرائط و اوصاف ضروری ہیں، وہ ان دونوں میں موجود ہیں، میں نے جو کچھ کہا اس سے ان غریبوں کو فتنۂ خلق سے محفوظ رکھنا مقصود تھا"[1] اس موقع پر مولانا شہاب الدین نے ..... پیش کیا[2] اور عرض کیا مخدوم اسے قبول فرمائیں؟ فرمایا میں نے قبول کیا، یہ کیا ہے، میں نے تو تمہارا سارا گھر قبول کیا، اس کے بعد ان کو کلاہ عطا ہوئی، انھوں نے تجدید بیعت کی درخواست کی، آپ نے قبول فرمایا۔

اس دوران میں قاضی مینا حاضر خدمت ہوئے میاں ہلال نے تعارف کرایا، اور عرض کیا یہ قاضی مینا ہیں، فرمایا، قاضی مینا! قاضی مینا! قاضی مینا نے کہا حضرت حاضر ہوں؟

[1] یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ [2] یہاں پر جو عبارت ہے وہ سمجھ میں نہیں آئی۔

اور ہاتھ کو بوسہ دیا، آپ نے ان کا ہاتھ اپنے چہرہ و ریش مبارک اور رخسار پر پھیرا، اور فرمایا "خدا کی تم پر رحمت ہو، با ایمان رہو اور با ایمان دنیا سے جاؤ" ، ازراہِ شفقت یہ بھی فرمایا کہ "بینا ہمارے ہیں" اس دوران میں مولانا ابراہیم آئے آپ نے اپنا دایاں ہاتھ ان کی داڑھی پر پھیرا، اور فرمایا کہ "تم نے میری اچھی خدمت کی، اور پورا ساتھ دیا با آبرو رہو گے" مولانا ابراہیم نے عرض کیا، مخدوم...... مجھ سے راضی ہیں؟ فرمایا "ہم سب سے راضی ہیں، تمہیں بھی ہم سے راضی ہونا چاہیئے، جو کچھ ہے میری طرف سے ہے" اس کے بعد قاضی شمس الدین کے بھائی قاضی نور الدین حاضر ہوئے، آپ نے قاضی نور الدین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور بڑی شفقت کے ساتھ ان کی داڑھی، چہرہ، رخسار اور ہاتھ کو کئی بار بوسہ دیا، آپ آہ آہ کرتے جاتے تھے، آپ نے ان سے فرمایا کہ "تم ہماری صحبت میں بہت رہے ہو اور ہماری بڑی خدمت کی ہے، انشاء اللہ کل ایک ہی جگہ رہیں گے" اس کے بعد مولانا نظام الدین کو ہی حاضر ہوئے، فرمایا "غریب اپنا وطن چھوڑ کر ہمارے جوار میں آگیا تھا" یہ کہہ کر کلاہ مبارک اپنے سر سے اتار کر ان کو عطا فرمائی، اور حسنِ عاقبت کی دعا فرمائی، اور فرمایا "حق تعالےٰ تمہیں مقصود تک پہنچائے" پھر سب حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: "دوستو! جاؤ اپنے دین وایمان کا غم کھاؤ، اور اسی میں مشغول رہو"۔

اس کے بعد کاتب سطور زین بدر عربی نے دست مبارک کو بوسہ دیا، اپنی آنکھ، سر اور بدن پر پھیرا، ارشاد ہوا کون ہے؟ میں نے عرض کیا گدائے آستانہ توجہ کرتا ہے، اور عرض کرتا ہے کہ مجھے از سرِ نو غلامی میں قبول فرمایا جائے؟ فرمایا: "جاؤ تم کو قبول کیا، تمہارے گھر اور تمام اہل خاندان کو قبول کیا، خاطر جمع رکھو اگر میری آبرو رہی تو کسی کو بھی چھوڑنے والا نہیں ہوں" میں نے عرض کیا مخدوم تو مخدوم ہیں، مخدوم کے غلاموں کی بھی آبرو ہے، فرمایا "امیدیں تو بہت ہیں"۔

قاضی شمس الدین آئے اور حضرت کے پہلو میں بیٹھ گئے، مولانا شہاب الدین ہلال و عقیق نے عرض کیا کہ مخدوم! قاضی شمس الدین کے باب میں کیا ارشاد ہوتا ہے؟ فرمایا قاضی شمس الدین کے بارے میں کیا کہوں، قاضی شمس الدین میرا فرزند ہے، کئی جگہ میں اس کو فرزند لکھ چکا ہوں، خط میں میں نے اس کو برادرم بھی لکھا ہے، ان کو علم درویشی کے اظہار کی اجازت ہو چکی، انھیں کے خاطر اتنے کہنے اور لکھنے کی نوبت آئی، ورنہ کون لکھتا؟

اس کے بعد برادر و خادمِ خاص شیخ خلیل الدین نے جو پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا، آپ نے ان کی طرف رخ کیا اور فرمایا "خلیل! خاطر جمع رکھو، تم کو علما و درویش چھوڑیں گے نہیں، ملک نظام الدین خواجہ ملک آئے گا، اس کو میرا اسلام و دعا پہونچانا، میری طرف سے بہت معذرت کرنا، اور کہنا کہ میں تم سے راضی ہوں، اور راضی جا رہا ہوں، تم بھی راضی رہنا" ـــ فرمایا جب تک ملک نظام الدین ہے تم کو نہ چھوڑے گا، شیخ خلیل الدین بہت متأثر تھے، آنکھوں میں آنسو تھے، حضرت مخدوم نے جب ان کی دل شکستگی دیکھی تو بڑی شفقت سے فرمایا "خاطر جمع رکھو اور دل کو مضبوط رکھو" اس کے بعد فرمایا "کون ہے"؟ ہلال نے عرض کیا مولانا محمود صوفی ہیں، آپ نے بڑے گہرے افسوس کے ساتھ فرمایا کہ "بیچارہ غریب ہے، مجھے اس کی بڑی فکر ہے، بیچارے کا کوئی نہیں" اس کے بعد ان کے لئے حسن عاقبت کی دعا فرمائی، اس کے بعد قاضی خاں خلیل حاضر خدمت ہوئے، فرمایا "بیچارہ قاضی ہمارا پرانا دوست ہے، ہماری صحبت میں بہت رہا ہے، اللہ تعالے اس کو جزا دے اور عاقبت بخیر کرے، اس کے فرزند بھی ہمارے دوست ہیں، سب کی عاقبت بخیر ہو، اور حق تعالے دوزخ سے رہائی دے"!

اس کے بعد خواجہ معز الدین مشرف بخدمت ہوئے، فرمایا:- "عاقبت بخیر ہو" پھر مولانا

فضل اللہ نے قدمبوسی کی، فرمایا "بھلے بھلے اللہ عاقبت بخیر کرے" فتوح باورچی روتا ہوا آیا، اور قدموں میں گر گیا، فرمایا "بیچارہ فتوحا جیسا کچھ تھا میرا ہی تھا" اس کے حق میں بھی دعائے عاقبت فرمائی، اس کے بعد مولانا شہاب الدین نے شرف قدمبوسی حاصل کیا، ہلال نے تعارف کرایا کہ مولانا شہاب الدین حاجی رکن الدین کے بھائی ہیں، فرمایا: "انجام بخیر ہو ایمان کا غم کھاؤ، اور رحمت حق کے امیدوار ہو کر پڑھو "لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا"

کچھ دیر کے بعد نماز ظہر کے قریب سید ظہیر الدین اپنے چچا زاد بھائی کے ساتھ حاضر خدمت ہوئے آپ نے سید ظہیر الدین کو بغل میں لے لیا، اور بڑے لطف و شفقت کے ساتھ فرمایا "میں جو عاقبت عاقبت کہتا تھا یہی عاقبت ہے" اس کے بعد تین مرتبہ ان کو بغل میں لیا، اور آخری بار یہ آیت پڑھی "لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا" اور حاضرین کو رحمت و مغفرت خداوندی کا امیدوار بنایا، اس کے بعد وہاں سے اٹھے اور حجرہ میں تشریف لے گئے، اور سید ظہیر الدین کے ساتھ کچھ دیر بیٹھے، اور ان سے کچھ دیر باتیں فرمائیں، اس کے بعد سلطان شاہ پرگنہ دار راجگیر اپنے بیٹے کے ساتھ حاضر خدمت ہوا، اور ایک روغن کا سرِ ریاح پیش کیا، ارشاد ہوا مولانا نظام الدین بھی لائے تھے اور پھر شربت اور پان دے کر معذرت کی، اس کے بعد خلیل کے بھائی منور نے عرض کیا کہ توبہ و بیعت کرنا چاہتا ہوں؟ فرمایا۔ آؤ! اس کی جانب ہاتھ بڑھا کر توبہ و بیعت سے مشرف فرمایا، پھر قینچی طلب کی، قینچی سے بال تراشے اور کلاہ پہنائی اور فرمایا، جاؤ دوگانہ ادا کرو، اس طرح اس کے بیٹے نے بھی بیعت کی اس کو بھی یہی حکم ہوا۔

اسی اثنا میں قاضی عالم احمد مفتی مولانا نظام الدین مفتی کے بھائی جو مریدانِ خاص

میں سے ہیں آئے، اور ادب کے ساتھ آپ کے سامنے بیٹھ گئے اسی درمیان میں ملک حسام الدین کے بھائی امیر شہاب الدین اپنے لڑکے کے ساتھ حاضر خدمت ہوئے، اور آکر بیٹھ گئے، آپ کی نظر مبارک لڑکے پر پڑی، آپ نے فرمایا "پانچ آیتیں پڑھ سکتے ہو؟ حاضرین نے عرض کیا ابھی چھوٹا ہے، سید ظہیر الدین مفتی کا لڑکا بھی حاضر تھا، میاں ہلال نے جب یہ دیکھا کہ آپ کو اس وقت کلام ربانی سننے کا ذوق ہے انھوں نے اس لڑکے کو بلایا، اور پانچ آیتیں پڑھنے کی ہدایت کی، سید ظہیر الدین نے بھی جب یہ محسوس کیا کہ طبیعت مبارک پر قرآن مجید سننے کا تقاضا ہے تو اپنے لڑکے کو اشارہ کیا کہ قرآن مجید کی پانچ آیتیں پڑھو، لڑکا سامنے آیا اور مؤدب بیٹھ گیا، اس نے سورہ فتح کے آخری رکوع کی آیتیں "مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهٗ" پڑھنی شروع کیں، حضرت مخدوم تکیہ کے سہارے سے آرام فرما رہے تھے، اٹھ بیٹھے اور معمول قدیم کے مطابق باادب دوزانو بیٹھ گئے، اور بڑی توجہ سے قرآن مجید سننے لگے، لڑکا جب "لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ" پر پہونچا تو مرعوب ہوگیا، اور اس سے پڑھا نہ جا سکا، آپ نے اس کو آگے کے لفظ کی تلقین فرمائی، جب لڑکے نے قرأت ختم کی تو آپ نے فرمایا "اچھا پڑھتا ہے، اور خوب ادا کرتا ہے، لیکن مرعوب ہو جاتا ہے" اس موقع پر آپ نے ایک مغربی درویش کا ذکر کیا کہ کبھی اس کی طبیعت حاضر ہوتی تھی، اور قرآن مجید سننے کا ذوق ہوتا تھا، اور کبھی طبیعت حاضر نہیں ہوتی تھی، اور قرآن مجید سننے کا ذوق نہیں ہوتا تھا۔

اس کے بعد قاضی عالم کو شربت اور پان دینے کو ارشاد ہوا، معذرت فرمائی، آپ نے پیراہن جسم سے اتارنا چاہا، اور وضو کے لئے پانی طلب فرمایا، اور آستین سمیٹی، مسواک طلب فرمائی، آواز سے بسم اللہ پڑھی، اور وضو شروع فرمایا، اور ہر موقع کی ادعیہ پڑھیں، کہنیوں تک دونوں ہاتھ دھوئے، منھ دھونا بھول گئے، شیخ فرید الدین نے یاد دلایا کہ منھ دھونا رہ گیا ہے،

آپ نے ازسرنو وضو شروع کیا، اور بسم اللہ اور وضو کی دعائیں جس طرح سے آئی ہیں، بڑی احتیاط کے ساتھ پڑھتے تھے، مفتی سید ظہیر الدین اور حاضرین مجلس دیکھتے تھے، اور تعجب کرتے تھے، اور آپس میں کہتے تھے کہ ایسی حالت میں یہ احتیاط؟ قاضی زاہد نے پاؤں دھونے میں مدد کرنی چاہی، حضرت مخدوم نے ان کو روک دیا، اور فرمایا: "کھڑے رہو" اس کے بعد سے خود سے پورا وضو کیا، وضو مکمل کرنے کے بعد کنگھی طلب فرمائی، اور داڑھی میں کنگھی کی، اس کے بعد مصلّٰی طلب فرمایا، نماز شروع کی، اور دو رکعت میں سلام پھیرا، تکان ہو جانے کی وجہ سے کچھ دیر آرام فرمایا، شیخ جلیل الدین نے عرض کیا، حضرت سلامت حجرہ میں تشریف لے چلیں، ٹھنڈک کا وقت ہو گیا ہے؟ آپ کھڑے ہوئے، جوتیاں پہنیں، اور حجرہ کی طرف چلے، آپ کا ایک ہاتھ مولانا زاہد کے کاندھوں پر تھا، دوسرا مولانا شہاب الدین کے کاندھوں پر، حجرہ میں آپ ایک شیر کی کھال پر لیٹ گئے، میاں منور نے بیعت توبہ کی درخواست کی، آپ نے ان کی طرف ہاتھ بڑھا دیا، اور ان کو توبہ و بیعت سے مشرف کیا، اور ان کے سر کے بال دونوں جانب سے تھوڑے تراشے، ان کو کلاہ پہنائی اور فرمایا، "جاؤ دوگانہ ادا کرو" یہ آخری بیعت توبہ تھی جو آپ نے کرائی، اس موقع پر ایک عورت اپنے دو لڑکوں کے ساتھ حاضر ہوئی، اور شرف قدمبوسی حاصل کیا، نماز عصر کے بعد مغرب کی نماز کے نزدیک خدام نے عرض کیا، حضرت چارپائی پر آرام فرمائیں؟ آپ چارپائی پر تشریف لے گئے اور آرام فرمایا۔

نماز مغرب کے بعد شیخ جلیل الدین، قاضی شمس الدین، مولانا شہاب الدین، قاضی نور الدین ہلال، اور عفیق اور دوسرے احباب و خدام جو خدمت میں مصروف تھے، چارپائی کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے تھے، حضرت مخدوم نے کچھ دیر کے بعد باآواز بلند

بسم اللہ کہنی شروع کی، کئی بار بسم اللہ کہنے کے بعد زور زور سے پڑھا، "لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظَّالِمِیْنَ" اس کے بعد بار بار بلند آواز کے ساتھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا، پھر کلمۂ شہادت "أشهد ان لا إله الا الله وحده لا شريك له واشهد أن محمداً عبده ورسوله" اس کے بعد فرمایا: "لاحول ولا قوۃ إلا بالله العلی العظیم" پھر کچھ دیر تک کلمۂ شہادت زبان پر جاری رہا، پھر کئی بار فرمایا: "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لا إله الا الله محمد رسول الله" اس کے بعد بڑے اہتمام سے اور دل کی بڑی قوت اور بڑے ذوق و شوق سے "محمد، محمد، محمد، اللهم صل علی محمد وعلی آل محمد الخ" پھر یہ آیت پڑھی "رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ تا آخر رضیت بالله ربا وبالاسلام دینا وبمحمد صلی الله علیه وسلم نبیا" الخ اس کے بعد تین مرتبہ کلمۂ طیبہ کا ورد فرمایا پھر آسمان کی طرف ہاتھ بلند کئے، اور بڑے ذوق و شوق کے ساتھ جیسے کوئی دعا اور مناجات کرتا ہے، فرمایا: "اللهم اصلح أمة محمدؐ اللهم ارحم أمة محمدؐ اللهم اغفر لأمة محمدؐ اللهم تجاوز عن أمة محمدؐ اللهم اغث أمة محمدؐ اللهم انصر من نصر دین محمدؐ اللهم فرج عن أمة محمدؐ فرجا عاجلاً اللهم اخذل من خذل دین محمدؐ برحمتك یا أرحم الراحمین" ان الفاظ پر آواز بند ہوگئی، اس وقت زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری تھے "لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ" لا إله الا الله" اس کے بعد ایک بار "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کہا، اور جان بحق تسلیم ہوئے، یہ واقعہ شب پنجشنبہ ۲۰ شوال ۱۰۸۲ھ عشا کی نماز کے وقت کا ہے، اگلے روز پنجشنبہ کے دن نماز چاشت کے وقت تدفین عمل میں آئی۔[۱]

---

[۱] از رسالہ "وفات نامہ" از شیخ زین بدر عربی، مطبع مفید عام۔ آگرہ ۱۳۲۱ھ

حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے آخری ایام زندگی

اہل معرفت ومحبت اور اللہ تعالیٰ کے مخلص ومقبول بندوں کے انتقال کا وقت وہ خاص لمحہ ہوتا ہے جس میں بلند ولطیف معانی مثلاً محبت ووفا، شوق لقاء، اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین کامل اور اس کی خوشنودی ورضا کی طلب زندہ اور متحرک ہوکر اپنی سب سے دلآویز شکل میں سامنے آتی ہے، یہ وہ ساعت ہے، جب وہ معانی وحقائق جس کے لئے انہوں نے زندگی بھر مجاہدہ کیا تھا، اور اپنے کو اس میں فنا کر دیا تھا، ان کو اپنے جلو میں لے لیتے ہیں، اور جس دن کے لئے وہ دن گن رہے تھے، اور اس وقت کے اس طرح منتظر تھے جس طرح شام ہوتے وقت پرندا اپنے آشیانہ کے لئے بیتاب ہوتا ہے، وہ وقت ان کو نصیب ہوتا ہے، اس وقت ان کی پوشیدہ وساکن محبت جوش مارنے لگتی ہے، اور ان کے اندر سرور ومستی کی ایک غیر معمولی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور اس وقت ان پر بعض ایسے احوال ظاہر ہوتے ہیں، کہ جس پر دنیاوی عیش وتنعم کے پروردہ لوگوں کو بھی رشک آتا ہے، اور ان کو تمنا ہوتی ہے کہ ان کو بھی یہ مرتبہ حاصل ہو اور مقبولیت کی ان علامتوں سے وہ بھی سرفراز ہوں، جو حاصلِ زندگی ہے۔

اس سے بہت سے خوش نصیبوں کو جن کو اللہ تعالیٰ نے شرح صدر کی دولت سے

نوازتا ہے، نیز بہت سے غیر مسلم اصحاب کو بھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ان امور کا تعلق ضرور کچھ غیبی حقائق سے ہے، اور حس اور مادہ کی محدود دنیا سے ماورا ایک اور حسین اور کہیں زیادہ وسیع عالم ہے ؎

"حسن سے بھی بلند تر عشق سے بھی لطیف تر"

یہ وہ عالم ہے جس کے لئے اہل معرفت، اہل قلوب اور اصحاب یقین جان و دل سے سرگرداں و کوشاں رہتے ہیں، ان کے طرز عمل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے انھوں نے اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے[۱]، اس سلسلہ میں ہم مولانا شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی کے حالاتِ وفات آپ کے سامنے پیش کریں گے، یہ استقامت، اتباع سنت، دنیا سے بے تعلقی، محبت و فنائیت، ایمان و یقین اور ذوق و شوق کا ایک عجیب نمونہ ہے، اور اس کو پڑھ کر دل میں خود بخود ان حضرات کی پیروی اور اس مرتبہ تک پہونچنے کی خواہش پیدا ہونے لگتی ہے۔

"۷ ربیع الاول کو نماز عصر ادا فرمانے کے بعد فرمایا:- کتاب لاؤ، حکیم عظمت حسین صاحب نے سبق شروع کیا، تھوڑا سا پڑھا تھا کہ مولوی عبدالغفار صاحب کتاب صحیح مسلم لے کر حاضر ہوئے، حکیم صاحب نے کتاب بند کر دی، اور مولوی عبدالغفار صاحب نے پڑھنا شروع کیا، قریب تیرہ[۱۳] صفحہ کے پڑھا سبق ختم ہونے کے بعد یہ کلمات فرمائے "جاؤ کتاب مسجد میں بند کر کے رکھ آؤ" یہ سبق آخری تھا، جو آپ نے بیٹھ کر درس کے طور پر پڑھایا، اس

---

[۱] حضرت بلالؓ کا وہ واقعہ اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے، جب ان کے مرض وفات میں ان کی تکلیف کو دیکھ کر صحابۂ کرام نے کہا "واکرباہ" "آہ کتنی تکلیف ہے، وہ یہ جملہ سن کر بے چین ہو گئے، اور فرمایا" واطرباہ غداً الاقی الاحبۃ محمداً وحزبہ" "واہ کتنی مسرت و طرب کا موقع ہے کل محمد صلے اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب سے ملاقات ہوگی۔

لفظ (بند کرکے) پر کسی کو لحاظ نہ ہوا کہ آج سے آپ سبق بند فرماتے ہیں[1]۔

۸ ربیع الاول کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے کچھ فضائل بیان کرکے آپ نے اس شعر کو دو مرتبہ پڑھا ؎

سر سبز سبزہ ہو جو ترا پائمال ہو
ٹھہرے تو جس شجر کے تلے وہ نہال ہو

اس وقت حاضرین کی عجیب کیفیت تھی کہ دلگزاری سے سب پر ایک حالتِ رقت طاری تھی[2]۔

بعد اس کے آپ نے یہ شعر پڑھا ؎

بندۂ عیب دار کس نخرد
با ہزاراں گنہ خرید مرا

آپ روئے، اور عجیب کیف کی حالت تھی کہ بیان میں نہیں آتی[3]۔

اسی حالت کیف میں فرمایا کہ "امتیان محمدی میں سے بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ حوریں ان کی مشتاق ہیں، جب وہ جنت میں بلا حساب کتاب جائیں گے تو حوریں ان کے دیکھنے کو دوڑیں گی، اور وہ محوِ تجلیات کبریائی ہوں گے، دوزخ کی طرف سے ہو کر گذریں گے تو دوزخ ان سے پناہ مانگے گی، اور ان کے چہرے مثل ماہتاب کے درخشاں ہوں گے[4]۔

آج سے محویت کی کیفیت اور استغراق کی حالت بڑھتی جاتی تھی کہ بسا اوقات آپ اپنے ہر وقت کے حاضر باش خادموں کو بھی نہیں پہچانتے تھے، آپ کے معمولات میں سے تھا کہ بعد نماز ظہر عرائض سنا کرتے تھے فرمایا: آج بہت خطوط ہیں، آپ نے ان پر دم کردیا اور فرمایا خدا سب کا کام

---

[1] ہدیۂ عشاق صہ [2] تواریخ نامہ صہ [3] ایضاً [4] ہدیۂ عشاق صہ

پورا کر دے[1]"۔

۹ ربیع الاول کو فرمایا "اللہ پاک اپنے بندوں کو بہت پیار کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں، جو ان کے خاص بندے ہو جاتے ہیں، تو اگر ان کو کچھ تکلیف پہونچتی ہے، اور صبر کرتے ہیں تو ملائکہ سے خطاب ہوتا ہے کہ دیکھو میرا بندہ کیسی مصیبت میں مبتلا ہے، اور شکر و صبر کرتا ہے، گواہ رہو کہ میں نے بخش دیا" بعدہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں کچھ احادیث پڑھیں، اور بہت رقت طاری رہی، ——————— اور جوش و خروش کی حالت ظاہر ہوئی[2]۔

بارھویں تاریخ تک ترقی ضعف کی یہی کیفیت رہی، جو کوئی پوچھتا کہ حضور کا مزاج کیسا ہے، تو فرماتے "الحمد للہ اچھا ہوں، صرف ضعف ہے" کبھی حضرت شاہ آفاق پیر و مرشد اور اولیاء اللہ کا ذکر فرماتے اور کہتے ؎

اے شہ آفاق شیریں داستاں — باز گو از بے نشاں من نشاں
صرف و نحو و منطقم را سوختی — آتش عشق خدا افروختی[3]

۱۳ ربیع الاول ۱۳۱۳ھ کو آپ نے مولوی وحید احمد صاحب سے ارشاد فرمایا کہ بھائی میری چارپائی کے پاس بیٹھ جاؤ، اور حسب ذیل ارشادات فرمائے ؎

خدمت مرداں اگر یک ساعت است
بہتر از صد خدمت و صد طاعت است

سلف میں ایسے ایسے اولیاء اللہ گذرے ہیں کہ جو کلمہ گو دور سے ان کی زیارت کر کے چلا گیا، اللہ تعالیٰ نے اس پر رحم فرمایا، اور اس کو بخش دیا، بعض ایسے گذرے ہیں جس پر انھوں نے

---

[1] تواریخ نامہ ص۴ [2] ہدیۂ عشاق ص۹ [3] تواریخ نامہ ص۴-۵

ایک نظر ڈالی وہ ولی ہو گیا، بعض حاضرین نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور کو بھی ایسا ہی کیا ہے، اس پر کوئی جواب نہ دیا۔[۱]

۱۶ ربیع الاول سے آخری وقت تک یہ شعر آپ کے ورد زبان تھا ؎

فسهل یا الٰهی کل صعب
بحرمة سید الأبرار سهل[۲]

۱۸ ربیع الاول کو قاضی نور الحسن صاحب ہاشمی ملاواں سے بغرض عیادت حاضر ہوئے تھے، ذرا دیر کے بعد آپ نے داہنا ہاتھ دراز فرمایا کہ جیسے کسی سے مصافحہ کے واسطے بڑھاتے ہیں، اور اٹھ بیٹھے، اور فرمایا آتے ہیں کپڑے تو پہن لیں، ان لوگوں سے فرمایا، جو مرید ہوئے تھے کہو مرید ہوئے ہم حضرت شاہ آفاق صاحبؒ کے ہاتھ پر قادریہ خاندان میں نماز روزہ، حج، زکوٰۃ فرض ہیں، دیوالی، دسہرہ بسنت کچھ نہ ماننا۔"[۳]

۱۹ ربیع الاول کو ۱۲ بجے پھر پیر سرد ہوئے، اور حرارت کا غلبہ ہوا، آپ حالتِ غشی میں نصف جسم سے اٹھ بیٹھتے تھے، اور فرماتے میں کیا کروں؟ کوئی حاضرین میں سے عرض کر دیتا کہ حضور آرام فرمائیں، فوراً لیٹ جاتے اور شعر ؎

فسهل یا إلٰهی کل صعب
بحرمة سید الأبرار سهل

پڑھتے، بخلاف زمانہ گذشتہ کی بیماریوں کے آپ ان بیماریوں میں آہ آہ بہت کرتے لیکن اس مرتبہ اف تک بھی نہ فرماتے، خاموش لیٹے رہتے اور جو دوا صاحبزادے صاحب پیش کرتے فوراً اس کو نوش فرماتے، ذرا انکار نہ کرتے، سابق کی بیماریوں میں دوا سے انکار

---

۱ ہدیۂ عشاق ص۱۲ ۲ تواریخ نامہ ص۵ ۳ ہدیۂ عشاق ص۱۹

فرماتے تھے، مگر عام طور سے کسی کے ہاتھ سے دوا نہیں پیتے صرف صاحبزادے صاحب کو یہ شرف حاصل رہا۔[۱]

ساڑھے چھ بجے سہ پہر کو حرارت بہت کم ہو گئی تھی، اس وقت حضرت پیرانی صاحبہ نے حکیم صاحب کو بلایا، اور دریافت حال کیا، اگرچہ حکیم صاحب نے بہت کچھ تسکین دی، لیکن درجۂ اجابت تک نہ پہونچی کہ اتنے میں حضور پر نور نے یہ شعر بہ زبان فصیح پڑھا ؎

سرم خاکِ رہِ ہر چار سرور
ابو بکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ

اس وقت حضور کو فی الجملہ تسکین تھی، اور اس شعر کے پڑھنے سے تمام حاضرین و نیز اندرونِ حویلی سب کو بہت تسکین ہوئی۔[۲]

بیسویں کو خواب استراحت سے دفعتاً اٹھ بیٹھے، اور فرمایا کہ، یہ بہشت یہ بہشت یہ بہشت یہ بہشت، اور چاروں سمت دست مبارک سے اشارہ کیا، اور فرمایا کہ رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔[۳]

اکیسویں کو دو بجے دن کو آپ نے فرمایا کہ ہم مرگئے، ہمارے جنازے کی نماز پڑھ دو اور اگر کوئی نہ پڑھے تو میں خود پڑھے لیتا ہوں، اور تمام مقتدی کھڑے ہیں، اللہ اکبر فرما کر ہاتھ باندھ لئے، سب کو اس جملہ سے بہت تردد ہوا۔[۴]

سوا دو بجے فرمایا کہ اگر ہم کو کوئی حدیث سناتا تو بہتر تھا کہ ہمارا دم حدیث شریف سنتے سنتے نکلتا۔[۵]

۲۲ ربیع الاول بروز جمعہ ۳ بجے حاضرین کا مجمع کثیر تھا، صاحبزادہ احمد میاں کو

---

[۱] ہدیۂ عشاق ص۲۰ [۲] ایضاً ص۲۱ [۳] تواریخ نامہ ص۵ [۴] ایضاً ص۲۵ [۵] ہدیۂ عشاق ص۲۵

آنکھیں کھول کر بغور دیکھا، پھر ان کا داہنا ہاتھ اپنے ہاتھ سے دو تین منٹ تک خوب مضبوط پکڑے رہے۔ بعدہٗ چشم خدا بیں سے دوبارہ دیکھ کر ہاتھ چھوڑ دیا، اور آنکھیں بند کرلیں[1]۔

ساڑھے تین بجے دست مبارک اٹھا کر نہایت خضوع سے دعا فرمائی کہ "اے اللہ پاک آپ میرے جملہ مریدین و معتقدین، دوست واحباب، اعزہ واقارب کو خوش و خرم کھاتا کھلاتا رکھئے گا، اور سب کا خاتمہ بخیر کیجئے گا[2]، آمین آمین آمین"۔

سوا چار بجے سے تنفس شروع ہوا، اس سے یہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ آپ "لا الٰہ إلا اللہ" فرماتے ہیں، قبل اس کے کبھی آپ نے اس طرح کا ذکر جلی نہیں فرمایا، ہمیشہ ذکر خفی فرماتے تھے کہ دیکھنے والوں کو معلوم نہیں ہوتا تھا[3]۔

تین چار روز سے حاضرین کا وہ مجمع تھا کہ لوگ ہٹائے جاتے تھے لیکن نہ ہٹتے تھے، ایک کے اوپر ایک گرے پڑتے تھے، ہر شخص کی یہ تمنا تھی کہ میں شریک خدمت ہوں اور زیارت سے شرف یابی حاصل کروں، ان چار دنوں میں کئی مرتبہ مرادآباد میں مشہور ہوا کہ جناب مولانا صاحب کا وصال ہوگیا، ہر شخص جہاں تھا وہیں سے دوڑا، اندر سے باہر تک ایک تلاطم برپا ہوجاتا تھا، اور جو اپنی جگہ سے ہٹا اس کو وہ جگہ نصیب نہیں ہوتی تھی، اس لئے کہ جگہ کی قلت تھی، اور آدمیوں کی کثرت، تمام حاضرین و مریدین اطراف سے اتفاقاً فتح پور ہسوہ کے آدمی زیادہ حاضر تھے[4]۔

---

[1] ہدیۂ عشاق ص۲۶-۲۷ [2] تواریخ نامہ ص۵ [3] ایضاً [4] فتح پور ہسوہ میں حضرت مولانا کے دو خلفاء و مریدان باختصاص موجود تھے، حضرت مولانا نور محمد پنجابیؒ صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ اور جناب مولانا سید ظہور الاسلام فتح پوریؒ۔

سوا چار بجے سے تنفس میں فرق آگیا، اور امید زلیست منقطع ہوگئی، چنانچہ حسب وصیت جناب حکیم عظمت حسین صاحب نے کتاب چہل حدیث پڑھنا شروع کیا، اور راقم سے صاحبزادے نے ارشاد فرمایا: "تم بھی کتاب لاؤ" میں بھی کتاب صحیح مسلم کو جس کا ایک سبق پڑھا تھا، لے آیا، صاحبزادے صاحب نے فرمایا بالجہر پڑھو تاکہ لوگ سنیں لیکن حضور پرنور کی وہ حالت دیکھ کر مجھ سے بالجہر نہ پڑھا گیا، صاحبزادہ صاحب نے مکرر فرمایا کہ بالجہر پڑھو تاکہ سب لوگ سنیں، میں نے کتاب الایمان کا ایک صفحہ مشکل سے بالجہر پڑھا، اور ایک حدیث آخر کتاب کی پڑھ کر بند کردی۔[1]

تنفس بڑھتا گیا اور اب بلغم حلق میں آکر اٹک گیا، اور تھوکنے کی قوت باقی نہ رہی، آپ اس حالت میں بار بار سر مبارک اٹھانے کا ارادہ فرماتے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ کوئی روح پرفتوح تشریف لاتی ہے جس کی تعظیم کے واسطے سر مبارک کو جنبش دیتے ہیں، ہم کور باطنوں کا اس میں حصہ نہ تھا، غرض کہ ہر شخص کچھ نہ کچھ پڑھنے لگا، کوئی یٰسین شریف کوئی درود شریف کوئی کلمہ، کوئی بالجہر کوئی بالسر پڑھتا تھا، اگرچہ عام طور پر اس بات کا یقین نہ تھا کہ یہی آخری وقت حضرت صاحب کا ہے، لیکن اس کرب کو ہر شخص دیکھ کر غمگین تھا، چنانچہ سوا پانچ بجے سے حکما نے کل تدبیریں چھوڑ دیں اور آب انار شیریں کیوڑہ ڈال کر دینا شروع کیا، کبھی حکیم عظمت حسین صاحب اور کبھی صاحبزادے صاحب اور کبھی حکیم عبدالباسط صاحب اور کبھی راقم (عبدالغفار) چمچہ سے لے کر بسم اللہ کہہ کر حضور کے دہن مبارک میں ڈال دیتے، قاعدہ یہ تھا کہ جب بسم اللہ کہتے، حضور دہن مبارک کھول دیتے، اور آب انار ڈال دیا جاتا۔[2]

---

[1] ہدیۂ عشاق ص ۲۸۰۲۷ [2] ایضاً

سب کی رائے ہوئی کہ اب تہبند کھول لیا جائے اور پائجامہ پہنا دیا جائے، چنانچہ صاحبزادے صاحب و غلام قادر خاں صاحب والہ دیا خاں صاحب نے پائجامہ پہنانا شروع کیا، غلام قادر خاں صاحب نے تہبند جو مثل پائجامہ کے بنا ہوا تھا اپنے پیر سے گھبراہٹ میں اتارنا چاہا اسی وقت پائے مبارک کھینچ لیا، اور بایاں پاؤں دراز کیا، سبحان اللہ! اس وقت بھی کس قدر اتباع شریعتِ محمدی کا خیال تھا۔[1]

نمازِ مغرب کے بعد حالت اور زیادہ قریب الوصال ہو گئی، بعد نماز کے سب لوگ واپس آ گئے، اس وقت سب کی رائے ہوئی کہ چارپائی کا رخ پھیر دینا چاہیے، لیکن اس طرح کہ سب پر ظاہر نہ ہو جائے، فوراً چارپائی شمالاً جنوباً کر دی گئی، اور روئے مبارک قبلہ کی طرف کر دیا گیا، قریب سات بجے کے بالکل الوداعی سامان ظاہر ہو گئے، سوا چار بجے سے جو تنفس کی حالت تھی، وہ ایسی تھی، گویا ذکر و شغل کی حالت میں کوئی اپنی سانس بڑھاتا ہے، اور صاف مفہوم ہوتا تھا کہ حضور "لا إله الا الله" فرماتے ہیں، اس سے قبل کبھی کسی نے شاید ایسا ذکر جلی کرتے نہ دیکھا ہو گا، اس اخفا سے آپ ذکر کرتے تھے، کہ دیکھنے والے کو ہرگز نہ معلوم ہوتا تھا۔[2]

گرداگرد چارپائی کے جو لوگ موجود تھے، عجب سکون سب کے دل کو تھا، اگرچہ بہت بڑے بڑے جاں نثار حاضر تھے، لیکن کسی پر گھبراہٹ اور یاس کا عالم نہ تھا۔[3]

شام کے وقت ۲۲ تاریخ راقم کو شبہ تھا کہ شاید چاند نکلا ہے، اسی کی روشنی نیم کے درخت پر جو چھپر کے باہر تھے، پڑ رہی ہے، افسوس اس وقت خیال نہ آیا کہ یہ وقت نزول رحمت الٰہی اور ورود برکت نامتناہی کا ہے، اور یہ اس کی تجلیات ہیں۔

---

[1] ہدیۂ عشاق ص ۲۸ [2] ایضاً ص ۲۹-۳۰ [3] ایضاً ص ۳۰

بعد مغرب کے اس قدر قوت لب مبارک میں باقی نہ تھی کہ زیادہ جنبش کر سکتے، اور نہ دہن مبارک وا ہو سکتا تھا کہ چمچہ سے کوئی چیز دہن مبارک میں ڈالی جاتی، یہاں تک کہ کپڑے کے پھایہ سے آب انار اور کیوڑہ یا کیوڑہ اور پانی دیا جانے لگا، راقم (عبدالغفار) نے اس خدمت کو مغرب سے آخر وقت تک انجام دیا، صاحبزادے صاحب (احمد میاں) سرہانے بیٹھے ہوئے تھے، راقم بھی سرہانے بیٹھا تھا، اسی تنفس ذکری کی حالت میں (۲۲ ربیع الاول ۱۳۱۳ھ) کو بعد مغرب آپ نے سانس اوپر کر لی، اور روح پُرفتوح نے جسم خاکی کو چھوڑا، اور عالم بالا کی طرف پرواز کی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔[1]

اس وقت جسم اطہر سے اس قدر خوشبو آتی تھی کہ جس کا کپڑا آپ کے جسم سے چھو گیا اس میں خوشبو آنے لگی، لوگ ایک دوسرے پر گرتے تھے کسی کا دل قابو میں نہ تھا، سب لوگ روتے تھے، مگر سبحان اللہ! کہ آپ کو جیسی پابندی شرع کی بہ حالت حیات تھی، ویسی ہی بعد ممات بھی رہی کہ جو کوئی چلا کر رویا، فوراً بیہوش ہو گیا کہ سرو پا کی خبر نہ رہی، جو لوگ خاموش تھے، اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے، ــــــــــ وہ بھی ہوش میں نہ تھے، غرضکہ تمام ہندو مسلمان رونے میں مبتلا تھے، قیامت برپا تھی، عورتیں بھی سب حویلی سے آئیں، روتی ہوئی جب قریب پہونچیں آواز موقوف ہو گئی، صرف آنسو جاری تھے، کوئی کلمہ، کوئی درود پڑھنے لگا، جنازۂ اطہر پر نوحہ و بکا نہیں ہوا، اور کیونکر ہوتا کہ ہمارے حضرت نے کبھی بہ حالت حیات اس بات کو جائز نہیں کہا۔

تمام شب لوگ جنازہ کے گرد حاضر رہے، خوشبوئے اگر و عود جلائی گئی، تمام شب میں اس قدر لوگ جمع ہو گئے کہ مسجد میں اور باہر کہیں جگہ نہ رہی، اور انوار و تجلیات کا

---

[1] ہدیۂ عشاق فضل رحمانی ص ۲۷-۳۰

کیا ذکر کیا جائے کہ ایک نورانی چادر سب کو ڈھانکے ہوئے تھی، جو لوگ کہ نعش مبارک کے گرد بیٹھے ہوئے تھے، قرآن خوانی اور ذکر و شغل میں مشغول تھے، ہرگز اس مقام پر یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کوئی موت ہوئی ہے کہ جیسے اور گھروں میں موت کے بعد دیکھا گیا ہے، بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے حضور روزانہ آرام فرماتے تھے، آج بھی اسی طرح آرام فرما رہے ہیں۔[1]

---

[1] ہدیۂ عشاق ص۳۱-۳۲، ماخوذ از "تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی" از مصنف۔

پندرھویں صدی ہجری کے لئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کا ایک عظیم تحفہ

ایک حیات آفریں پیغام

تاریخ دعوت وعزیمت

(چھ حصوں میں)

حصہ اوّل: پہلی صدی ہجری سے لے کر ساتویں صدی ہجری تک عالم اسلام کی اصلاحی وتجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ، نامور مصلحین اور ممتاز اصحاب دعوت وعزیمت کا مفصل تعارف، ان کے علمی کارناموں کی روداد اور ان کے اثرات ونتائج کا تذکرہ۔

حصہ دوم: جس میں آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عالم ومصلح شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کی سوانح حیات۔ ان کے صفات وکمالات۔ ان کی علمی وتصنیفی خصوصیات، ان کا تجدیدی واصلاحی کام اور ان کی اہم تصنیفات کا مفصل تعارف اور ان کے ممتاز تلامذہ اور منتسبین کے حالات۔

حصہ سوم: حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ، حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے سوانح حیات، صفات وکمالات، تجدیدی واصلاحی کارنامے، تلامذہ اور منتسبین کا تذکرہ وتعارف۔

حصہ چہارم: یعنی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ (۹۷۱-۱۰۳۴ھ) کی مفصل سوانح حیات، ان کا عہد اور ماحول، ان کے عظیم تجدیدی وانقلابی کارنامے کی اصل نوعیت کا بیان، ان کا اور ان کے سلسلے کے مشائخ کا اپنی اور بعد کی صدیوں پر گہرا اثر اور ان کی اصلاحی وتربیتی خدمات۔

حصہ پنجم: تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، احیائے دین، اشاعت کتاب وسنت، اسرار ومقاصد شریعت کی توضیح وتنقیح۔ تربیت وارشاد اور ہندوستان میں ملت اسلامی کے تحفظ اور تشخص کے بقا کی ان عہد آفریں کوششوں کی روداد، جن کا آغاز حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے اخلاف وخلفا کے ذریعے ہوا۔

حصہ ششم: حضرت سید احمد شہیدؒ کے مفصل سوانح حیات، آپ کے اصلاحی وتجدیدی کارنامے اور غیر منقسم ہندوستان کی سب سے بڑی تحریک جہاد وتنظیم، اصلاح وتجدید اور احیائے خلافت کی تاریخ۔ (دو جلدوں میں مکمل)

ناشر: فضل ربی ندوی

مجلس نشریات اسلام ۱-کے ۳۰ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸

محققین اور علمائے کرام کی اہم اور بصیرت افروز تصنیفات

کتاب	مصنف
سیرت حضرت عائشہؓ	علامہ سید سلیمان ندویؒ
یادِ رفتگان	〃 〃
خطبات مدراس	〃 〃
حیات امام مالک	〃 〃
سیر افغانستان	〃 〃
آپ بیتی	مولانا عبدالماجد دریابادیؒ
معاصرین	〃 〃
بشریت انبیاء	〃 〃
سیرت نبویؐ قرآنی	〃 〃
وفیات ماجدی	〃 〃
قصص و مسائل	〃 〃
قرآن آپ سے کیا کہتا ہے	مولانا محمد منظور نعمانی
دین و شریعت	〃 〃
اسلام کیا ہے؟	〃 〃
حضرت عثمان ذوالنورینؓ	مولانا سید احمد اکبرآبادیؒ
فہم القرآن	〃 〃
وحی الٰہی	〃 〃
مجالس صوفیہ	مولانا سید صباح الدین عبدالرحمنؒ
بزم رفتہ کی سچی کہانیاں	〃 〃
مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب	〃 〃
قرآن مجید اور دنیائے حیات (وجدید سائنس کی روشنی میں چند حقائق)	مولانا شہاب الدین ندوی
اسلامی شریعت علم اور عقل کی میزان میں	〃 〃
قرآن، سائنس اور مسلمان	〃 〃
تخلیق آدم اور نظریہ ارتقا	〃 〃
لغات القرآن	مولانا عبدالکریم پاریکھ
قوم یہود اور ہم قرآن کی روشنی میں	〃 〃
صدر یار جنگ (مولانا حبیب الرحمن شیروانی کی سوانح حیات)	مولانا شمس تبریز خاں
مسلم پرسنل لاء اور اس کا عائلی نظام	〃 〃
اسلام اور غیر اسلامی تہذیب	شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ
سیرت خلفائے راشدینؓ	امام اہلسنت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ
تاریخ مشائخ چشت	حضرت مولانا محمد زکریاؒ
معاشرتی مسائل	مولانا محمد برہان الدین سنبھلی
شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں	سید شہاب الدین دسنوی
مولانا محمد علی مونگیریؒ	مولانا محمد الحسنی ندویؒ
جزیرۃ العرب	مولانا محمد رابع ندوی
تعلیم القرآن	مولانا اویس نگرامی ندویؒ
محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے	مولانا تقی الدین ندوی
حسن معاشرت	خیر النساء صاحبہ (مرحومہ) والدہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
ریاض الصالحین (اردو) دو جلدوں میں مکمل	امۃ اللہ تسنیم
اصح السیر	مولانا حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف داناپوریؒ
اسلام کا زرعی نظام	مولانا محمد تقی الدین امینی
مقالات سیرت	ڈاکٹر آصف قدوائی
عیون العرفان فی علوم القرآن	قاضی مظہر الدین بلگرامی
سیرت الصدیقؓ	مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانیؒ
عورت	افتخار فریدی
طوفان سے ساحل تک	محمد اسد سابق لیوپولڈ وس
علم جدید کا چیلنج	وحید الدین خان

ناشر: فضلِ ربی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱-کے-۳۰ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ٹ کراچی ۱۸